January
2021
جدید تر ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور
2021
سالِ نو مبارک

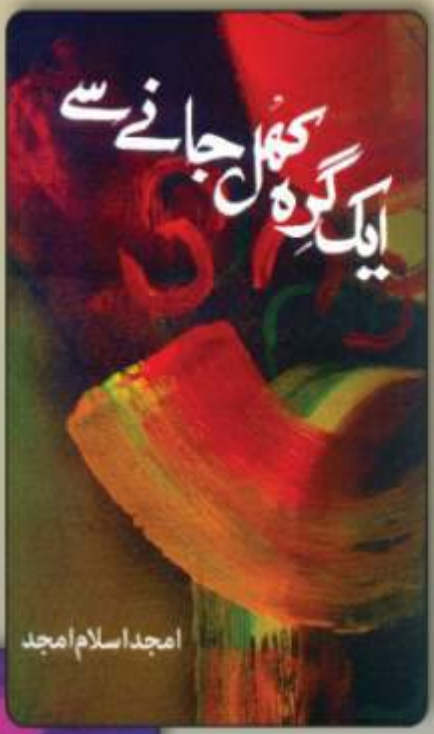
ایک گرہ کھل جانے سے
امجد اسلام امجد

خواب سمندر
امجد اسلام امجد

بانی مدیر: خالد احمد

بیان

حَل ہو گئے تضاد ، ہر اک چاک سِل گیا

ویران مَندروں کے گجر کیوں خموش ہیں؟

کیا گیان ایک ایک پُجاری کو مِل گیا

محترم قارئین نوٹ فرمائیں! ماہنامہ بیاض، لاہور جنوری 2021 سے ہماری ویب سائٹ

www.trackntie.com

BAYAZ

پر موجود ہے۔ مطالعہ کیجیے اور ہمیں اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔ [ادارہ]

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - جنوری 2021 - شمارہ نمبر: 1

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

نجیب احمد | اعجاز رضوی | نعمان منظور | کنور امتیاز احمد | جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: خوش آمدید سالِ نو

قیمت: 100 روپے

سالانہ زراعانت 1000 روپے بیرون ملک $100 پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 92-42-37513000-3 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹرز دعا لیکسائل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی	7
2	نعتؐ	آصف ثاقب، نسیم سحر، محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز ازھر منیر، اکرم ناصر، عقیل رحمانی، سرور حسین نقشبندی ایم ارشد ارشد، صغیر احمد صغیر، محمود کیفی	8 تا 18
3	عقیدت	شہزاد احمد شیخ	19
4	رباعیات	خاور اعجاز	20
5	ہائیکو	شبہ طراز	21
6	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	22 تا 26
7	افسانے	بلقیس ریاض، نیلم احمد بشیر، انعام الحسن کاشمیری امین کنجاہی، رومانہ رومی، امین جان، نور کمال شاہ سید ارشاد حسین شاہ، کرن اُجالا	27 تا 68
8	مائیکرو فکشن	سعدیہ بشیر	69 تا 71
9	تراجم	پیروز بخت قاضی	72 تا 77
10	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی اعجاز کنور راجہ، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، صفدر صدیق رضی	78 تا 159

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	شاہین مفتی، راحت سرحدی، خاور اعجاز، رشید آفرین محمد انیس انصاری، سید قاسم جلال، سید ضیا حسین، شوکت محمود شوکت منظور ثاقب، ممتاز راشد لاہوری، احمد جلیل، اکرم ناصر، اقبال سروبہ یعقوب پرواز، سعداللہ شاہ، شکیل اختر، شبہ طراز، حامد یزدانی کبیر اطہر، واجد امیر، شفیق احمد خان، جسارت خیالی، آسناتھ کنول جاوید شیدا، گل بخشالوی، عقیل رحمانی، محمد نوید مرزا، زبیر فاروق شاداب صدیقی، ثمینہ سید، آفتاب خان، امین کنجاہی، ریاض رومانی نعیم رضا بھٹی، اشرف کمال، صغیر احمد صغیر، تاثیر نقوی، رضااللہ حیدر حسنین سحر، ظہور چوہان، افضل گوہر، ارشد سعید، ارشد محمود ارشد عاطف جاوید عاطف، انصر حسن، شہزاد احمد شیخ اکرم جاذب عزم الحسنین عزمی، اسد اعوان، احسان گھمن، امتیاز علی گوہر ذکی طارق، وسیم عباس، امر مہکی، محمد اویس راجا، امجد معراج ساجد محمود رانا، وجاہت تبسم، اسد رضا سحر، فوزیہ مغل، رومانہ رومی نبیل قیصر، عدنان نبیل، اکرام اکرم، رانا سرفراز طاہر، امجد بابر اسحاق وردگ، محسن رضا ثانی، تاثیر جعفری، گوتم ملتانی، رقیہ اکبر عدنان خالد، احمد محسود، سیدہ کوثر منور، نائلہ راٹھور، روا حاصل خلوص عنبرین خان، محمد علی ایاز، محمد حماد خاں	78 تا 159
11	مضامین	محمد ارشاد، سلمٰی اعوان، اسلام عظمی، محمد حنیف، غافر شہزاد حامد یزدانی، وجاہت تبسم، (نامعلوم)	160 تا 205
12	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	206 تا 214
13	نظمیں	امجد اسلام امجد، جلیل عالی، جمیل یوسف، نسیم سحر سید افسر ساجد، منظور ثاقب، ازھر منیر، حامد یزدانی اقبال سروبہ، رخشندہ نوید، امجد بابر، شوکت محمود شوکت سعدیہ بشیر، ذکی طارق، عطاالعزیز، نائلہ راٹھور، اعجاز رضوی	215 تا 234
14	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، نسیم سحر، آفتاب احمد ملک فرخندہ شمیم، رانا محمد شاہد، دردانہ نوشین خان	235 تا 241

حمد

وہ ہے اک آئینہ گر، یا اسے بھی آئینہ کہیے
اسے اب کیف و مستی میں کوئی بتلائے کیا کہیے

وہی رستہ دکھاتا ہے، وہی آسانیاں بانٹے
وہی مشکل کشا اپنا اسے ہی رہنما کہیے

ہمیں معلوم ہے یہ زندگی اک آزمائش ہے
رکھے جس حال میں مالک اسے اُس کی رضا کہیے

کرم اس کا رہا ہر حال میں ہم بے نواؤں پر
کہ ہے وہ قادرِ مطلق اسے حاجت روا کہیے

اسی نے غیب سے امداد کی، دیکھا یہی ہم نے
اسے ہی سب غریبانِ جہاں کا آسرا کہیے

وہی آباد ہے اب تک شکستہ دل میں، وہ جانے
اسی کی جستجو رہتی ہے پھر بھی اور کیا کہیے

وہی معبود ہے، مسجود ہے، رب دو عالم ہے
جو مانا ہے اسے خالق تو پھر اس سے سوا کہیے

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

میری آنکھوں میں چراغاں ہے محمدؐ نام سے
دل منوّر جان تاباں ہے محمدؐ نام سے

اس میں رہتی ہیں درود پاک کی شادابیاں
میرا سینہ کتنا شاداں ہے محمدؐ نام سے

میں تغزل میں بھروں یادِ مدینہ کی کسک
یہ غزل میری غزالاں ہے محمدؐ نام سے

میرے خیمے میں انہیؐ کا ذکر ہوتا ہے مدام
کتنا پُررونق بیاباں ہے محمدؐ نام سے

ہجر کی بے تابیوں میں نام چمکے آپؐ کا
میری خلوت حشر ساماں ہے محمدؐ نام سے

دین کے احسان سے ہیں حوصلے اتنے بڑھے
زندگی بھی جانِ جاناں ہے محمدؐ نام سے

بڑھ رہا ہے جانبِ منزل دعا کرتے ہوئے
کاروانِ خوش گماناں ہے محمدؐ نام سے

میں نے ثاقبؔ غم کی وہ بنیاد رکھی عشق میں
میرا ہر آنسو نمایاں ہے محمدؐ نام سے

آصف ثاقب

نعتؐ

جو مِل سکتا تھا مجھ کو، سب ملا ہے
فروغِ نعت کا منصب ملا ہے

کرم ہے میرے آقاؐ کا یہ مجھ پر
اُنہی کے واسطے سے رب ملا ہے

محبت اور دیانت ہی سِکھائی
مجھے آقاؐ کا جو مکتب ملا ہے

کسی سے دُشمنی کرتا نہیں میں؟
مجھے اِک صلح جُو مذہب ملا ہے

سبھی برکات حمد و نعت کی ہیں
سکوں جو مجھ کو روز و شب ملا ہے

مرے آقاؐ کو تھی نفرت سے نفرت
مجھے برداشت کا مشرب ملا ہے

رضائے رب ہے بس اُنؐ کی ثنا میں
اشارہ یہ مجھے ہر شب ملا ہے

نسیمِ سحر

نعتؐ

درکار ہے جذبوں کو ضُوا اور طرح کی
یہ بزم ہے اے مدح سرا اور طرح کی

کون آیا بھلا آج تری خلوت جاں میں
خوشبو ہے تری دل کے حرا اور طرح کی

جن سینوں میں بستی ہے مدینے کی وہ بستی
ان سینوں کی ہوتی ہے فضا اور طرح کی

ہوتی ہے جنھیں سیدِؐ ابرار سے نسبت
ان ذرّوں کو ملتی ہے ضیا اور طرح کی

ہو جاتے ہیں جو حلقہ بگوشِ شہِؐ والا
اُن لوگوں کی ہوتی ہے ادا اور طرح کی

یہ قریۂ محبوبؐ ہے، یہ شہرِ نبیؐ ہے
تکریم ہے اس کی اے دلا اور طرح کی

ادراک میں کب آئے "رفعنا لک ذکرک"
ہے رفعتِ محبوبؐ خدا اور طرح کی

ہوتا ہے رواں قافلہ جب سوئے مدینہ
ہر گام پہ ہوتی ہے ثنا اور طرح کی

ہر آن درودوں کی حدی ساتھ ہو تیرے
منزل ہے تری آبلہ پا اور طرح کی

ہمراہ مرے ساتھ ہے اک موجِ لطافت
مجھ پر ہے قمرؔ اُنؐ کی عطا اور طرح کی

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

نگاہ ڈالیں گے وہ فیضِ عام کرنے کو
کھڑے ہیں شاہ و گدا سب سلام کرنے کو

بنایا نعتِ نبیؐ کو وسیلہ بخشش
کہ اس سے اچھا نہیں کوئی کام کرنے کو

مدینہ ہو کے جو آ جائے ایک بار اُسے
بہشت کافی نہیں ہے خرام کرنے کو

کسی کو رُتبۂ عالی مِلا نہیں ایسا
بُلایا عرش پہ اُنؐ سے کلام کرنے کو

ہمیں ہے اُنؐ کی محبت کا آسرا خاورؔ
وگرنہ پھرتی ہے دُنیا غلام کرنے کو

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تاب سخن تمام

میلادِ پیمبرؐ

(پروفیسر اکبر منیرؔ صاحب کی فارسی نعت کا ترجمہ)

پھوٹی اُفق سے اک سحر، اِک صبح رحمت سے بھری
موجۂ سیلِ نُور تھی بزمِ خودی و بے خودی
حُسنِ ازل نے خاک کے چہرے کو جگمگا دیا
پیکرِ مصطفےٰؐ سے تھا ظاہر جلالِ ایزدی
صلِ علیٰ رسولہٖ، صلِ علیٰ حبیبہٖ

نورِ ازل دیں رفعتیں بُت کدۂ مجاز کو
رونقِ تازہ بخش دی بزمِ نیاز و ناز کو
خورشید و ماہ بنا لیا قبلۂ خود حجاز کو
حکمِ دُرود آ گیا خلوتیانِ راز کو
صلِ علیٰ رسولہٖ، صلِ علیٰ حبیبہٖ

بادشہِ پیمبراں رکھا قدم زمین پر
وحدتِ حق ہوئی رقم وسعتِ عالمین پر
پرچمِ دیں کیا بلند فارس و ہند و چین پر
کاری لگائی ضربِ تیغ فوجِ ستم آئین پر
صلِ علیٰ رسولہٖ، صلِ علیٰ حبیبہٖ

دُنیا کے واسطے رکھی تازہ اساسِ داوری
یاد دلایا خلق کو، شیوۂ مہرِ مادری
کی دفن اُس نے خاک میں قیصری اور سکندری
ختم ہوئی ہے آپؐ پر سروری اور پیمبری
صلِ علیٰ رسولہٖ، صلِ علیٰ حبیبہٖ

پختہ، پیام نے آپؐ کے، کر دیا مردِ خام کو
پرتوِ فیض نے آپؐ کے خواجہ کیا غلام کو
اندھے بھی دیکھنے لگے، حسنِ رُخِ دوام کو
جلوۂ تازہ اِک ملا، پیکرِ صبح و شام کو
صلِ علیٰ رسولہٖ، صلِ علیٰ حبیبہٖ

پہنچی ہر ایک بزم میں بڑے گلِ محمدیؐ (*)
نغمۂ بلبلانِ حق، سُننے لگی کلی کلی
پہنچا سرِ ابلیس تک تیشۂ قہرِ ایزدی
باغِ کہن میں فصل دیکھ آ گئی پھر بہار کی
صلِ علیٰ رسولہٖ، صلِ علیٰ حبیبہٖ

دیکھ تو کارواں میں پھر، مردمِ بے دلیل کو
دیکھ مجاہدیں سے پُر، وادیِ گنگ و نیل کو
سینۂ خاک پر رواں کوثر و سلسبیل کو
جنتِ جاوداں بنا گل کدۂ خلیلؑ کو
صلِ علیٰ رسولہٖ، صلِ علیٰ حبیبہٖ

صدقے رسولؐ پر صبا، قرباں ہمارے جسم و جاں
تارے یہ کہکشاں کے سب، صدقے یہ باغِ جاوداں
سنگ اُس کے آستاں کا، قبلۂ مہر و آسماں
گونجا ہے کائنات میں اپنا سرودِ کارواں
صلِ علیٰ رسولہٖ، صلِ علیٰ حبیبہٖ

ازھر منیر

---

* گلِ محمدی پھول کی ایک قسم کا نام ہے۔ یہاں مُراد حضرت رسالت مآبؐ کی ذاتِ قدسی صفات ہے۔

نعتؐ

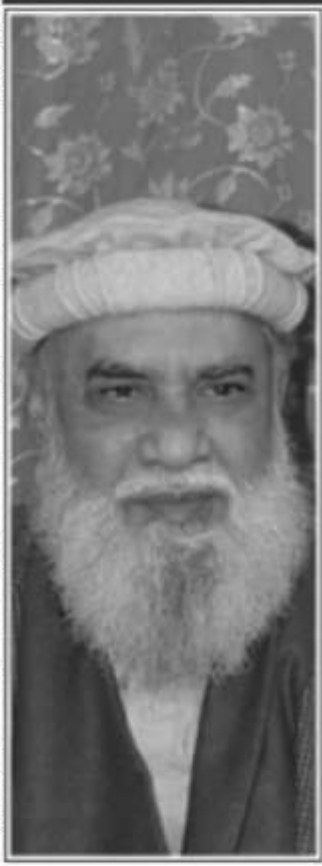

قلم کو اذن اور سوچوں کو اعتبار ملے
اگر ہو ایسا تو پھر نعت کو نکھار ملے

ذرا یہ سوچو اسے دیکھنے سے کیا ہو گا
مدینہ سوچ بھی لوں تو عجب خمار ملے

نکل کے شہر سے دیکھیں ہم آپ کا رستہ
کبھی ہمیں بھی تو وہ لطفِ انتظار ملے

خدا کا خاص کرم تھا حضور پر ورنہ
کہاں کسی کو بھلا ایسے جاں نثار ملے

حضور آپ کو شیر خدا ملے ہیں اور
ملے ہیں عمر اور عثمان ذی وقار ملے

کہاں کسی کو ملے آپ سا رفیقِ سفر
کہاں کسی کو کوئی ایسا یار غار ملے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چہرے پہ سایہ گر عجب ابرِ جمیل ہے
باغ جناں ہے پرتوِ رُخ سے بدن تمام

نعتؐ

آقاؐ کا میں نے نام لیا جب اُٹھا کے ہاتھ
شعلے گلاب بن گئے، مجھ کو لگا کے ہاتھ

خاکے بنانے والوں کا انجام خاک ہے
آقاؐ کی پشت پر ہیں سدا کبریا کے ہاتھ

کیسے بُجھا سکے گی چراغِ محمدیؐ
فانوس بنتے دیکھے ہیں میں نے ہوا کے ہاتھ

مرحب کو ایک وار میں دو نیم کر دیا
شیرِ خدا کے ہاتھ بنے، مصطفیٰؐ کے ہاتھ

کوئی گرا سکے نہ اُسے جسکو تھام لیں
میرے نبیؐ کے ہاتھ ہیں نورِ خدا کے ہاتھ

اُمت کی دستگیری کی خاطر عطا کیے
آقاؐ نے کتنی شان سے مُشکل کشاؓ کے ہاتھ

جس جا بھی اُمتی نے پکارا ہے یا نبیؐ
پہنچے ہیں اُس جگہ پہ شہِ انبیا کے ہاتھ

مجھ پہ رحیم آقاؐ نے اتنا کرم کیا
مجھ کو بُلانے آئے ہیں بادِ صبا کے ہاتھ

جب کہہ دیا حضورؐ نے میرا ہے اُمتی
منکر نکیر جائیں گے مُجھ سے ملا کے ہاتھ

دیں گے میرے حضورؐ اجازت تو پھر عقیل
میرے قریب آئیں گے میری قضا کے ہاتھ

عقیل رحمانی

نعتؐ

جب سے لو مدحتِ آقا سے لگائی ہوئی ہے
ایک خوشبو سی دہن میں اتر آئی ہوئی ہے

اک نظر گنبدِ خضراء کو میں کیا دیکھ آیا
آنکھ میں وسعتِ کونین سمائی ہوئی ہے

ایک نعت ایسی بھی ہے جو ابھی لکھی تو نہیں
لیکن اشکوں سے انہیں میں نے سنائی ہوئی ہے

ٹکٹکی باندھے ستاروں کی نظر ہے مجھ پر
خاک اس در کی جو پلکوں پہ سجائی ہوئی ہے

اسوۂ شاہِ اممؐ جس نے بھی اپنایا ہے
کائنات اس نے ہتھیلی پہ اٹھائی ہوئی ہے

موسمِ شہرِ پیمبر ترے جھونکوں پہ نثار
سانس لگتا ہے کہ خوشبو میں نہائی ہوئی ہے

اپنی قسمت پہ بھلا کیسے نہ پیار آئے مجھے
زندگی لے کے ترے شہر میں آئی ہوئی ہے

ریشم و اطلس و کمخواب ہیں صدقہ جس کا
چھال بستر کیلئے اس نے بچھائی ہوئی ہے

اس کے ملبوس پہ پیوند لگے دیکھتا ہوں
رب نے جس کے لئے ہر چیز بنائی ہوئی ہے

کتنے حیراں ہیں فرشتے بھی کہ شاہِ کل نے
سر پہ گٹھڑی کسی بڑھیا کی اٹھائی ہوئی ہے

نعت کہنے سے اگر دل نہیں بدلا سرورؔ
آنکھ پھر تو نے حقیقت سے چرائی ہوئی ہے

سرور حسین نقشبندی

دعا بحضور سرورِ کونینؐ

آے مرے ایماں کی منزل اے رسولوں کے رسُول
آپؐ کے قدموں کے نیچے دو جہاں کے عرض و طوُل

سینۂ افلاک سے برتر مدینہ آپؐ کا
خوشتر از زیتونِ جنت اس کی ہر شاخِ ببُول

آپؐ نے ذرّوں کو بخشی ہے ستاروں کی ضیا
کہکشاؤں میں چمکتی ہے حدی خوانوں کی دھُول

آپؐ کی نظرِ عنایت سے ہی یہ ممکن ہوا
کارزارِ زندگی میں کامرانی کا حصُول

دین و دُنیا میں عطا ہوں مجھ کو سرافرازیاں
میرے صحرا میں اُگا دیں سُنبل و سوسن کے پھُول

ارشدِ دریوزہ گر کی ایک ہی فریاد ہے
در گزُر فرمائیں ، ناداں سوختہ جانوں کی بھُول

ایم ارشد ارشد

نعتؐ

رب نے کہا کہ آج سے نعمت تمام شد
یا ایھا الرسول نبوت تمام شد

طائف سے لوٹتے ہوئے جبریل نے کہا:
قربان جاؤں آپ پہ رحمت تمام شد

سب انبیاء کرام کا لازم ہے احترام
لیکن مرے نبی پہ امامت تمام شد

ابنِ خلیل کی بھی رضا کو سلام ہے
اصغر پہ آ کے طرزِ شہادت تمام شد

مٹھی میں کنکروں نے پڑھا آپ پر سلام
یہ بھی کہا: اے منکرو حجت تمام شد

اہلِ عرب نے میرے نبی کا کہا سنا
بو بکر ہے وہ جس پہ صداقت تمام شد

باقی صغیرؔ یار تھے لیکن علیؑ ولی
یعنی علی کی ذات پہ قربت تمام شد

صغیر احمد صغیر

نعتؐ

آپؐ کا نام ہے ظلمت کو مٹانے والا
دِل میں چاہت کے چراغوں کو جلانے والا

آپؐ کیا آئے ، غریبوں کا مسیحا آیا
کون مُفلس کو تھا سینے سے لگانے والا ؟

زندہ درگور کیا کرتے تھے دُنیا والے
بیٹیوں کو تھا کہاں کوئی بچانے والا ؟

جان اپنی غمِ دوراں سے چُھڑا لیتا ہے
آپؐ کے ذکر کی محفل کو سجانے والا

آپ کے حُسن کا کرتا ہے نظارہ پیہم
آپؐ سے رشتۂ اُلفت کو نبھانے والا

آپؐ ہی کے یہ نواسے کی تھی جُرأت ، ورنہ
کون مقتل میں تھا سر اپنا کٹانے والا ؟

پیارے آقاؐ پہ ہُوئی ختم نبوت کیفیؔ!
اب نبیؐ دُنیا میں کوئی نہیں آنے والا

محمود کیفی

عقیدت

مری تجھ سے ہے التجا میرے مولا
مجھے سبز گنبد دکھا میرے مولا

رہوں خاک بن کر مدینے کی اب میں
یہی ہے مری اب دعا میرے مولا

میں بھیجوں درود و سلام اُن پہ ہر دم
ہو رحمت کی مجھ پر گھٹا میرے مولا

جنھیں تو نے محبوب اپنا کہا ہے
مجھے اُن کے جلوے دکھا میرے مولا

مرے سر کو تاجِ غلامی عطا کر
گدا اُن کے در کا بنا میرے مولا

سہی جائے دوری نہ طیبہ کی مجھ سے
سفر درمیاں کا گھٹا میرے مولا

شفا میری شہزادؔ خاکِ مدینہ
نہیں اور کوئی دوا میرے مولا

شہزاد احمد شیخ

رباعیات

خاور اعجاز

بھولے ہُوئے ویرانے میں جگنو کی طرح
اِک شخص ہے صحراؤں میں خوشبو کی طرح
مُدت سے کوئی اور نہیں آنکھوں میں
اِک یاد ہے ٹھہرے ہُوئے آنسو کی طرح

کچھ پرسشِ احوال کی تکریم تو ہو
احساسِ ملاقات کی تفہیم تو ہو
پیار محبت کی یہ اِک خواہش ہے
اَب درد ہی اُٹھے جری تعظیم تو ہو

بھولے ہُوئے نغموں کی صدا آئی ہے
بارش ہے کہ صحرا میں صبا آئی ہے
بھیگے ہوئے موسم میں ہے کیسی خوشبو
تم ہو کہ یہ ساون کی ہَوا آئی ہے

اِک شہر ہے بے داغ اُجالوں والا
ہر دَور میں پُر نور مثالوں والا
میں شہر کے دروازے پہ پہنچوں کیسے
رستہ ہے کہاں سبز خیالوں والا

ہائیکو

۱۔ جھرنوں کی آواز
منظر سپنوں جیسا تھا
دریائے کنہار

۲۔ صبح ہے دھند بھری
ملنے کی دل میں امید
کھونے کا خدشہ

۳۔ خوابوں کے ذرے
آنکھوں سے بہہ کر پہنچے
تکیے کے نیچے

۴۔ سرسوں رُت آئی
دھند پہاڑوں سے اتری
کھیتوں پر چھائی

۵۔ خوبانی کے پیڑ
پیر بہوٹی جیسی شام
سپنے ڈھیروں ڈھیر

۶۔ تیز ہوا کا شور
دور کہیں بادل گرجا ہے
ٹوٹا پھر اک خواب

۷۔ کافی کا اک مگ
دھواں ہے بیتی باتوں کا
صبح ہے سردی کی

۸۔ توڑوں میں کیسے
کانٹوں میں اک تنہا پھول
میرے احساسات

شبہ طراز

حاصل اور محرومی

جو اللہ کرے اس پر راضی رہنے کا نام اطمینان ہے زندگی تو ہے ہی ایسی کہ حاصل نے بھی پریشان کیا اور محرومی نے بھی آسائشوں نے بھی پریشان کیا اور نارسائی نے بھی مسند نے بھی پریشان کیا اور بے توقیری نے بھی بائیسویں سکیل نے بھی پریشان کیا اور درجہ چہارم کی نائب قاصدی نے بھی اے سی کی ٹھنڈی ہوا نے بھی پریشان کیا اور جون کی تپتی دوپہر کی لو نے بھی میٹھی نیند والے خراٹے بھی پریشان کن تھے کرار رت جگے بھی یہاں سلیپر ٹی بھی پریشان تھے اور راہ چلتے عام لوگ بھی جس شخص کو راہ چلتے ہوئے کوئی دوسری بار مڑ کر دیکھنے کا بھی تکلف نہیں کرتا وہ بھی پریشان ہے اور وزیر اعظم بھی ریڑھی والا بھی نالاں تھا اور صدر مملکت بھی۔

وجہ یہ ہے کہ اگر زندگی کو یہاں ٹھہرنے کی خواہش ہے تو پھر دکھ ہی دکھ ہوگا۔ اس لیے کیوں نہ ایسا کریں کہ میں اور آپ جس حالت میں رخصت ہونا چاہتے ہیں وہ ابھی سے اختیار کر لیں اور جو کچھ حاصل ہے اس پر مطمئن ہو جائیں زندگی کی خوشیوں کی کنجی یہی سوچ ہے اور جسے یہ کنجی مل گئی اس کی موج ہی موج ہے ورنہ دکھوں کی فوج ہی فوج ہے جو ہر وقت میرے اور آپ کے درپے آزار رہتی ہے اور رہے گی اور یہ جو میں نے مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا یہی اصل ہے کہ جس حالت میں میں مرنا چاہتا ہوں اس حالت میں زندگی گزارنا شروع کر دوں پھر میری موت نہ تو اچانک ہوگی اور نہ ہی یہاں سے جاتے ہوئے مجھے حسرت ہوگی۔ مجھے اس چیز کی ریہرسل کرنا ہوگی کہ ہر روز صبح نہ سہی تو ہفتے عشرے میں ایک بار صبح صبح خود پوچھوں کیا ابھی بلاوا آجائے تو یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جانے کے لیے تیار ہو؟

اگر ہمارا جواب اثبات میں ہو تو یہ حد درجہ اطمینان والی بات ہے اگر جواب نفی میں ہے تو پھر سوچ کی لوح کردار کے پنوار اعمال اور اموال پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کہ ہادی برحق نے اپنی سب سے لاڈلی بیٹی کی تربیت بھی انہی خطوط پر کی کہ جب کچھ خدام بارگاہ

سلیمان عبداللہ ڈار

رسالتؐ میں آئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا حسنینؑ کی ماں گھر کے کام کاج کی وجہ سے کپڑے اکثر میلے رہتے ہیں ہاتھوں پر چکی پیسنے سے گٹے پڑ گئے دن بھر کے کام کاج سے رات کو جسم تھکاوٹ سے چور ہو جاتا ہے (سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے یہ لوگ وجہ وجود کائنات تھے حضرت عمرؓ نے بھی عرض کیا تھا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خوبصورت بدن پر کھردری چٹائی کے نشان اور قیصر و کسریٰ جیسے آسائش کفار کے حصے لوٹیں دراصل اللہ کے سچے رسول نے معیشت آرام آسائش اور پیسے یا درہم و دینار والے شعبے کو دور خود اتنا سمجھا ہی نہیں اور نہ ہی آپؐ کے گھر والوں نے) حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا ابا جان سے کوئی خادم ہی مانگ لائیں آپؓ تشریف لے گئیں۔ سردار کائنات نے آتے ہوئے دیکھا تو محبت اور احترام سے اپنی چادر بچھائی اس پر بٹھایا آنے کا مدعا پوچھا پھر کچھ سوچ کر رحمت دو عالمؐ نے پیاری بیٹی سے کہا۔ ،، رات کو سبحان اللہ، الحمد اللہ، اللہ اکبر پڑھا کرو میری بیٹی تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔

راقم نے اس پر بہت سوچا دراصل یہاں ایک باریک نقطہ ہے عظمت اور بلندی جس عظیم معمار پر رشک کرتی ہے وہ چاہتا ہے کہ میرے بچوں کے دل اور ان کا یقین مال سے پھر کر اعمال پر آ جائے۔ ورنہ جہاں اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو خدام مل رہے تھے محبت بھری لاڈلی بیٹی کو تو ایک کیا ایک سے ایک بڑھیا غلام عطا کر دیتے مگر قربان جایئے حسن تربیت کے! سوچتا ہوں کوئی بڑے سے بڑا لیڈر بھی وہاں ہوتا (معاذ اللہ استغفر اللہ) تو ایسا نہ کرتا پھر ایسا کیوں ہوا۔ وہ اس لیے کہ انبیاء ڈائریکٹ رب کی تربیت میں ہوا کرتے ہیں۔ وہ حاصل پر مطمئن ہوتے ہیں انکے گھر کے ایک کونے میں جو مٹھی بھر جو ہوتے ہیں وہ انہی پر راضی رہتے ہیں۔

ہم اگر حاصل پر مطمئن ہو جائیں تو کیا ہوگا؟

* پھر ہمیں روز انہ کی ہوشربا دوڑ دھوپ بے فائدہ لگے گی۔
* پھر شکوہ گلہ اور مالک کی شکایت دل سے نکل جائے گی۔
* پھر ہم دوسروں پر تنقید سے اجتناب کریں گے۔
* اس دنیا کو بہر حال کسی نہ کسی روز چھوڑنا تو ہے ہی پھر اسے چھوڑنا یعنی مرنے سے پہلے مرنا آسان ہو جائے گا۔
* جسے معاف کرنا بہت ہی مشکل ہے اسے معاف کرنا آسان ہو جائے گا۔
* کہتے ہیں اللہ کو بخیل عابد سے سخی گناہگار زیادہ پسند ہے مال سے محبت کے باوجود پھر مال اللہ کی راہ خرچ کرنا آسان ہوگا۔
* ہمارے دن رات بہت مطمئن اور مسرور ہوں گے۔
* خواہشات کم ہو جائیں گی مسائل اور پریشانیاں کم ہو جائیں گی۔

* کرپشن کرنے اور حرام کمانے کو جی نہیں چاہے گا۔
* پھر مظلوم ہونا اک فیشن لگے گا ظلم کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوگی۔
* ربوبیت کی زیادہ نہ سہی کچھ کچھ تو سمجھ آئے گی رب کی طرف توجہ ہونے کی داغ بیل پڑے گی۔
* پھر چپ رہنا بولنے سے کہیں زیادہ بہتر لگے گا۔
* رب کا قرب دریافت ہوگا۔
* اپنی ذات کی پہچان کا سفر شروع ہوگا اور یہ آغاز رب کی پہچان کی طرف لے جائے گا۔
* آپ اپنے دشمن کو گھر بیٹھے فتح کر سکیں گے۔
* یہاں ٹھہرنے کی خواہش ہر کسی میں ہے مگر آپ اس خواہش پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکیں گے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ پھر جاتے وقت حسرت اور افسوس نہیں ہوگا۔
* پھر طبیعت ایسی بن جائے گی کہ جو اللہ کرے آپ اس پر راضی رہنے کا فن سیکھ لیں گے۔
* پھر دل کا گھر آباد ہو جائے گا اور دنیا کا کاٹھ کباڑ اس میں سے نکل جائے گا۔ حالانکہ اس دنیا کا سب سے مشکل کام یہی ہے۔
* دل میں ایک ایسا شوق پیدا ہوگا جو وجدا اور وجدان تک پہنچائے گا۔
* پھر ہم بیماری سے پریشان نہیں ہوں گے پھر علاج بھی اسی کے حوالے کر دیں گے جس کی طرف سے بیماری آئی تھی۔
* حاصل پر مطمئن ہو جانے والے اللہ کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔
* پھر روپیہ پیسہ آپ کا لازمہ یا زندگی کا مقصود نہیں رہے گا۔ پھر بینک بیلنس یا پے سکیل آپ کی پہچان نہیں بلکہ جذب و شوق آپ کی پراپرٹی کہلائے گا۔
* پھر غیر اللہ اور عین اللہ کی سمجھ آجائے گی۔
* پھر ہم ضمیر کی عدالت سے باعزت بری ہو جائیں گے ہم خود کو اپنے آپ کے سامنے پیش کرنے کی ہمت کر سکیں گے۔
* ایسا ہو سکے تو جب حاصل پر اطمینان اور لاحاصل کو رد کرنے کا حوصلہ مل سکے تو زندگی مطمئن مسرور اور بہت خوبصورت ہو جائے گی اس میں سے بے چینی افسردگی افراتفری اور دکھ درد دور ہو جائیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آرزو ہی زندگی ہے آرزوئیں پالنے میں حرج بھی کوئی نہیں خواب دیکھنا ضروری ہے ظاہر ہے ہم ان خوابوں کا پیچھا کریں گے انہیں شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے کوشاں ہوں گے تو ہی ترقی کریں گے کسی اعلیٰ مسند پر بیٹھائے جانے کے قابل ہو سکیں گے ایک بھرپور شاندار اور شان و شوکت سے پر زندگی گذارنے کے

قابل ہو سکیں گے مگر اس آرزو کی خواہش اور اس خواب کو خود پر اس قدر اور اتنا حاوی نہ ہونے دیں کہ یہ خواہشات جان کا آزار ہی بن جائیں۔ منہ زور خواہشات زندگی میں بے چینی پیدا کرتی ہیں جبکہ مطمئن مسرور بندے کو ہجوم میں تنہائیاں اور تنہائیوں میں ہجوم میسر آ جاتے ہیں راقم کو یاد ہے کہ سالہا سال پہلے جب کالج کے زمانہ تھا ہمارے گاؤں کے ایک اللہ والے جب رب کریم کی محبت بھری باتیں کرتے تو مجھ سے پوچھتے "کبھی خلوت در انجمن والی کیفیت بھی حاصل ہوئی؟"

مجھے ان دنوں اس بات کی سمجھ نہیں تھی (اب بھی نہیں) تو وہ کہتے کہ بعض اوقات اک ایسی کیفیت اللہ کی چاہت کرنے والوں کو میسر ہو جاتی ہے کہ وہ ہجوم میں ہوں تو بھی خلوت میں چلے جاتے ہیں۔ یعنی وہ رب کو یاد کر رہے ہیں اسکے حسین خیالوں کے جلووں میں گم ہیں:

عجب انداز خود وارفتگی ہے
بھری محفل میں سب کے درمیاں گم

.....

بس وہ دل ہی دل میں اپنے سچے ساجن سے محبت کی باتیں کر رہے ہیں ارد گرد کے شور و غل یا لوگوں کے لہو لعب سے بے نیاز ہو کر وہ ہجوم میں بھی تخلیہ میں ہوتے ہیں اور تخلیہ تو پھر ظاہر ہے اک میں ہوواں اک توں ہووِیں۔"

(پنجابی میں اک میں رہوں یا میرا محبوب ہووالی کیفیت کو کہتے ہیں) والی عشق حقیقی کی اوج کمال کو پہنچی ہوئی لذت کی تعبیر ہے۔

عمل سے بڑی کوئی کسوٹی نہیں جس پر کسی کو پرکھا جا سکتا ہے حضرت اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے بیٹے جناب جسٹس جاوید اقبال اپنی شہرہ آفاق تصنیف "زندہ رُود" میں یہی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ابا جی کی ساری شاعری اور زندگی کا نچوڑ دیکھا تو اس کا ون لائنر یہی تھا۔

"سوچ بہت بڑھیا ہو تو بھی عمل اس سے کہیں بہتر ہے"

حاصل پر اطمینان ہمیں عمل پر اکساتا ہے یہی عمل پھر دل کی کھیتی میں محبت کا بیج بو کر اسے قربانی کا پانی دیتا ہے۔ پھر اسی زمین سے ایسے پاکیزہ پودے اگتے ہیں جن پر اخلاص کے پھل اور پھول لگتے ہیں۔ مگر اس سب کے پیچھے وہی حاصل پر قناعت اور محرومی سے بے نیازی ہی ہوتی ہے۔ اور جب یہ بے نیازی حاصل ہو جائے تو پھر بندہ اپنی خوشیوں کا جہاں دوسروں کے دکھوں پر تعمیر نہیں کرتا۔ پھر اسے حقیقی عشق کے جذبات اور حیرتوں کی دنیا دیکھنے کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ دنیا حقیقتوں سے دور سہی مگر اس دنیا کے خوبصورت اور پر کیف ہونے میں انتہائی پر لطف ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اک بات تو بہر حال طے ہے کہ حاصل اور

محرومیاں مقدر میں لکھ دی گئی ہیں ہماری ازحد احتیاط اور حد درجہ کوشش سے بھی انہیں بدلا نہیں جا سکتا مسئلہ جبر و قدر پر اسی اسلیئے میں صدیوں سے بحث چلی آ رہی ہے ساری کی ساری قوتیں اور توانیاں صرف کر کے بھی محرومی کو حاصل کے قالب میں ڈھالنا عبث ہے ہاں دو صورتیں اس میں تبدیلی لا سکتی ہیں اک دعا اور دوسری صلہ رحمی ان دونوں صورتوں میں اللہ جل شانہ اپنے طے شدہ فیصلے کو بدل دیتے ہیں اور وہ اس پر قادر ہیں مندرجہ بالا سطور میں میں نے اپنے جن بزرگوں کا ذکر کیا ان سے جب بھی سوال کیا تو وہ اک مخمور سی نظر سے دل ہی دل میں عرش کی طرف دیکھنے لگے پھر کپکپاتی ہوئی محبت بھری آواز میں مجھے کہنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب! رب سے کوئی پوچھنے والا نہیں وہ طے شدہ تقدیر کو بدل بھی تو سکتا ہے۔ سچ کہ وہ مالک ہے جبار بھی ہے قہار بھی مگر وہ محبت کرنے والا سچا دوست بھی تو ہے۔"

مگر بعض اوقات بظاہر کچھ لوگوں کے حالات اتنے پاکیزہ نہیں بھی ہوتے۔ گواہیاں اور شہادتیں ان کے حق میں نہیں بھی ہوتیں مگر رب انہیں ہی زندگی عطا کر دیتا ہے حاصل تو ان کے پاس ہوتا ہی ہے وہ انہیں لاحاصل بھی بغیر سعی کے عطا کر دیتا ہے ایسا کیوں؟

وہ فرمانے لگے۔

"بس اسے کوئی ادا پسند آ سکتی ہے بے نیاز بادشاہ ہے دیا لو مالک ہے قابلیت نہیں قبول نہیں کرتا قبولیت کام کر جاتی ہے اور پھر پیار کچہری کا وہ خود جج ہے ایسے جج کو گواہوں اور شہادتوں کی کیا ضرورت!

اس دنیا میں روز ازل سے لکھاری۔ شاعر۔ ادیب اور دانشور ازل سے ایک ہی کہانی لکھ رہے ہیں حاصل اور محرومی کی کہانی! کبھی محبت حاصل ہو جاتی ہے کبھی بندہ محرومیوں کی اڈیالہ جیل کی کسی کال کوٹھڑی میں جا بیٹھتا ہے جہاں نہ روشنی نہ صاف پانی نہ آزادی نہ دوستوں کے قہقہے نہ گھر کا کھانا نہ آرام دہ بستر نہ اقتدار کی غلام گردشیں نا ہی چم چم کرتی مرسڈیز بینز گاڑیاں اور بھگیاں نہ ہی فلک شگاف نعرے نہ ہی بجتی ہوئی ائیریوں پر سجے سلیوٹ نہ ہی پانچ ستارہ سوئیٹ نہ ہی وال ٹو وال کارپٹ بس یہاں خستہ حال سیلن زدہ دیواروں والی کال کوٹھڑیاں ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر ہی مسندوں پر بیٹھنے والوں کو گھن آتی ہے پھر انہیں یہ سب دیکھ کر اک ہاں خیال تو آتا ہوگا کہ لاحاصل کے پیچھے پیچھے بھاگتے بھاگتے حاصل بھی گنوا بیٹھے اور اب محرومیوں کا اک جہاں منہ کھولے انہیں دبوچنے کو تیار نظر آ رہا ہے خواہشات کے آگے اگر یہی لوگ قناعت کا بند باندھ لیتے تو محرومیوں کی پاتال میں گرنے سے بچ تو سکتے تھے۔

☆☆☆☆☆

قابل رحم

بلقیس ریاض

امریکہ سے آنے والا جہاز لینڈ ہو چکا تھا۔ امیگریشن کے جھنجھٹ اور سامان کی وصولی کے بعد جب وہ باہر آئی تو اس کے نام کی تختی ایک شخص نے اپنے ہاتھ کو بلند کرتے ہوئے اٹھائی ہوئی تھی... ثنا... وہ جھٹ سے اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"جی میں ثنا"

تختی اٹھانے والے نے اسکی جانب غور سے دیکھا... وہ بلیک پینٹ اور چست ٹاپ پہنے ہوئے تھی... گوری رنگت... شانوں پر بال لہرائے... بڑی بڑی چمکتی نرگسی آنکھیں، گلاب کی پنکھڑیوں سے بھی نازک ہونٹ... سلم سمارٹ... خاصی خوش شکل لڑکی۔ وہ اس کے سراپے میں لحظہ بھر کے لیے محو ہو کر رہ گیا... وہ گویا ہوئی۔

"چلنا نہیں"

"اوہ"

"وہ" وہ چونک پڑا۔

باہر گہرے بادل چھائے تھے... فضا میں چار سو تاریکی اور مدھم سی لائیٹس نظر آ رہی تھیں... کہاں روشنیوں کے شہر نیویارک سے نکل کر یہاں آئی تھی... گاڑی کی ڈگی میں ارسلان نے سامان رکھا اور اگلی سیٹ کا

دروازہ کھول دیا۔۔۔وہ چپ چاپ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔۔۔اور بولی۔

"گھر میں سب خیریت ہے"

"جی"

وہ گاڑی کو تیزی سے بھگا رہا تھا تا کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جائیں۔

ذرا آہستہ چلائیں۔۔۔ یہاں کی ٹریفک تو ویسے ہی اتنی خراب ہے۔

"سب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں"۔

"اوہ"

وہ ایئرپورٹ کی حدود کو کراس کر کے مین روڈ پر گاڑی چلا رہا تھا۔

"کیا آپ بھی تقریب میں شمولیت کے لیے آئے ہیں"۔ وہ اسے کیا بتاتا۔۔۔شمولیت تو ایک طرف وہ خود قربانی کا بکرا سمجھ کر قربان ہونے والا تھا۔

وہ خاموش رہا۔۔۔پھر اسے حیرت ہونے لگی کہ بتایا گیا تھا کہ لڑکی سانولی ہے۔۔۔مگر نین نقش اچھے ہیں۔۔۔اتنی دور سے وہ خاص منگنی کے لیے آرہی ہے۔۔۔تم نے انکار نہیں کرنا۔

ارسلان جہاں بوکھلایا ہوا تھا۔۔۔اس کا حسین چہرہ دیکھ کر اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار ہو گیا۔۔۔یہ سب گھر والوں کی شرارت ہے۔۔۔ ورنہ دیکھنے میں تو اتنی حسین ہے۔۔۔خرم کی شادی کے ساتھ ساتھ نانی اماں اس کی منگنی بھی ثنا سے کرنے والی تھیں۔

رات سنسان اور تاریک تھی، بادل گھرے ہوئے تھے اور ہوا تیز چل رہی تھی۔۔۔لاہور شہر کے گھر۔۔۔دھندلی روشنی میں صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ساری فضا میں بدمزگی چھائی تھی۔ درختوں کے پتے۔۔۔جھڑ رہے تھے۔

ثنا کو ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے تھے۔ خیالوں کی دھوپ چھاؤں میں خرم کا دھندلا پیکر۔۔۔مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔۔۔کتنی ڈھٹائی سے سب کے سامنے کہہ دیا کہ میں ثنا سے شادی کروں گا۔ تو۔۔۔تائی جان کا خوفناک چہرہ یک دم جلالی ہو گیا۔

مگر اس کی منگنی تو دادی نے کر دی ہے۔۔۔اور باہر کی پڑھی لکھی لڑکی پاکستان میں نہیں چل سکتی۔۔۔اور آج وہ اسی خرم کی شادی کو اٹینڈ کرنے کے لیے آئی تھی۔ دادی نے بہت اصرار کیا تو ثنا کو آنا پڑا۔ گاڑی سبک رفتار سے چل رہی تھی وہ دونوں ہی خاموش تھے۔۔۔ثنا کو لینے تم نے جانا ہے۔۔۔ بہت سانولی نہیں ہے۔۔۔مگر۔۔۔تیکھے نین نقش اور اچھی لڑکی ہے۔۔۔تم اس کے ساتھ خوش رہو گے۔۔۔نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایئرپورٹ پر چلا گیا مگر ثنا کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا تھا۔۔۔ اتنی حسین من موہنی لڑکی جس کو سب ہی اسکی منگنی ارسلان سے کر کے احسان جتاتا

چاہتے تھے...وہ ایک خاص ادا کے ساتھ آگے ٹریفک کے ہجوم کو دیکھ رہی تھی۔

"خدا جانے یہاں کا نظام کب بدلے گا"۔

"بہت وقت لگے گا"۔

ابھی گاڑی ٹریفک لائیٹ پر رکی ہی تھی کہ فقیروں کی بھرمار شروع ہوگئی۔

اللہ جوڑی سلامت رکھے...خوشیاں دیکھو بی بی...بس ایک سو روپے کا سوال ہے۔

ثنا نے ارسلان کی جانب دیکھا تو وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا...والٹ سے سو روپیہ نکال کر فقیرنی کے ہاتھ میں رکھ دیا...اب اس کے بعد فقیروں کی بارش اور آوازیں آنے لگیں۔

"توبہ ہے"

"محترمہ آپ بھی اسی سرزمین کا پھول ہیں...ان باتوں کا عادی ہونا چاہیے"۔

"کیوں"

"ہوسکتا ہے.... مستقبل میں آپ پاکستان ہی رہیں"۔

"یہ کس نے کہہ دیا ہے آپکو"۔

"گھر والے کہتے ہیں"

"گھر والے!"

"کون"

"آپ بھولی تو نہیں...والدین نے آپ کو کچھ بتایا نہیں ہے"۔

"نہیں تو"

"کمال ہے...یہاں پر سب تیاریاں مکمل ہیں"۔

"کونسی تیاریاں"

"ارسلان مسکرایا"

"آپ کی منگنی کی"

"منگنی" وہ حیرت سے بولی۔

"میں شادی پر آئی ہوں...منگنی کروانے نہیں"...ارسلان کا دل...ایک دم سے بجھ گیا۔

"تو کیا واقعی آپ کو کچھ معلوم نہیں ہے"۔

"نہیں تو"

"پھر"

"پھر کیا...یہاں بسنے والے لوگ جو جی چاہتا ہے...کہہ دیتے ہیں"۔

"مگر...یہ حکم تو نانی اماں کا ہے"۔

"نانی اماں"

"جی"

اس نے ارسلان کی جانب دیکھا...میں جیتی جاگتی انسان ہوں... کوئی بھیڑ بکری نہیں...پچھلی مرتبہ بھول گئے ہیں کیا ہوا تھا۔

"میں پاکستان میں نہیں تھا"

"پھر کہاں تھے"

لندن میں تعلیم کے سلسلے میں گیا ہوا تھا...بائے دا وے (By the way)

کیا ہوا تھا۔

ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا... مجھ سے رائے لئے بغیر خرم نے کہہ دیا تھا۔

"کیا"

اچھا چھوڑیں اس قصے کو... میں تو آنا نہیں چاہتی تھی مگر مجھے اپنی دادی سے بہت پیار ہے... بہت محبت کے ساتھ انہوں نے مجھے بلوایا ہے۔

کمال ہے... کچھ بتایا بھی نہیں کہ کیوں بلوایا ہے"۔

"شادی اٹینڈ کرنے کے لیے"

"اور"

"اور کچھ نہیں"

"اچھا"

ارسلان بجھ سا گیا۔

"کیا ہوا... خاموش کیوں ہو گئے ہیں"۔

اوہ... میں نے جو آپ کے بارے میں نقشہ کھینچا تھا۔

"آپ اس کے برعکس ہیں"۔

"یعنی"

"اچھا چھوڑیے... اس قصے کو کوئی اور بات کرتے ہیں"۔

"کیا"

"یہی جب خرم کے لیے آپ کی تائی نے انکار کیا تو آپکو دکھ تو ہوا ہوگا"۔

"بالکل بھی نہیں... وہ تو خرم کا فیصلہ تھا... میرا تھوڑی تھا"۔

"سب تو یہی سمجھتے تھے"۔

"ان کی رائے غلط تھی"۔

"اب کوئی اور آپ کو پرپوز کرے گا تو آپ کیا کریں گی"۔

"مجھ سے پوچھے بغیر کوئی کیوں پرپوز کرے گا"۔

"بھئی... بزرگ اپنی رائے تو دے سکتے ہیں"۔

رائے دے سکتے ہیں اور اگر کوئی ان کی رائے پر عمل نہ کرے... اپنی بات کو مقدم سمجھے تو اس رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی... ٹھیک ہے اپنے والدین اور ان کے والدین رائے دے سکتے ہیں..... مگر لڑکے یا لڑکی کو نامنظور ہو تو باہر کے والدین بچے کی رائے کو مقدم جانتے ہیں۔ اپنے بچوں کے ساتھ زبردستی نہیں کرتے... آپ لندن میں پڑھتے رہے ہیں... وہاں سے آئے ہیں جان تو گئے ہونگے کہ وہاں پر پلنے والے بچے پاکستانی یا انگریز ہوں... مگر ان کی اٹھان ایک جیسی ہوتی ہے۔ ارسلان گہری سوچ میں ڈوب گیا... خرم کی شادی کے لیے تمام رشتے دار اکٹھے ہوئے تھے... اور زیادہ تر ارسلان کی شادی کے

لیے رشتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا... ثنا کے ساتھ شادی کرنے کا نانی جان نے فیصلہ کرلیا تھا... اور ارسلان کو منایا جارہا تھا کہ لڑکی امریکہ سے آرہی تم اسے غور سے دیکھنا اچھی لگے تو تقریب میں ہی اس کی منگنی کردی جائے گی۔ یہ بھی کہا جارہا تھا کہ وہاں اچھے رشتوں کی بہت کمی ہے۔ ارسلان اپنے آپ کو مظلوم سمجھ رہا تھا مگر نانی کا حکم تھا... کہ ثنا کو دیکھنا اور پرکھنا ہے... بچی بہت اچھی ہے... اس کے ماں باپ کو فون کے ذریعے اطلاع دے دوں گی اور ارسلان کے ساتھ منگنی کردوں گی۔ مگر ثنا حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی... والدین کو خبر نہیں اور یہاں پر اس کی منگنی کے چرچے ہو رہے تھے۔

ثنا نے ارسلان کی جانب دیکھا۔

وہ کون خوش نصیب ہے... جس کے ساتھ میری منگنی کرنا چاہتے ہیں۔

ارسلان... خاموش رہا۔

وہ بولی۔

"اتنا بڑا پاکستان ہے... لڑکیوں کی کمی نہیں ہونی چاہیے..."

"کمی تو واقعی اس کے لیے نہیں تھی مگر نانی جان اپنے خاندان کی لڑکی سے اس کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں"۔

"خیر یہ تو اچھی بات ہے"۔

اچھا یہ تو بتائیں اگر آپ کی شادی پاکستان میں ہو جائے تو کونسی خوبیاں شوہر کے اندر ہونا ضروری ہوگئیں۔

"میں"

"پُر اعتماد ہو... شکی نہ ہو... لبرل اور جاب کے راستے میں حائل نہ ہو... گھر کی سیاست سے دلچسپی نہ لے... بحیثیت ایک انسان کے وہ انسانیت کا جذبہ رکھتا ہو... انسان کو انسان سمجھے۔ روز پاکستان سے لڑکوں کی تصویریں والدین بھیج دیتے ہیں... صرف گرین کارڈ کے لیے شادیاں کرنا چاہتے ہیں"۔

لیکن آپ کے ساتھ جس لڑکے کی منگنی ہونی ہے وہ گرین کارڈ کے بجائے اچھی بیوی چاہتا ہے۔

"اچھی سے مراد" وہ پھر بولی۔

"یعنی اس کے تابع رہے"۔

"ایسی بات نہیں ہے"۔

ایسی ہی ہے... نہ اس کے تابع رہے بلکہ گھر والوں کے بھی تابع رہے... آتے وقت ایک لڑکے کی تصویر نانی جان نے پوسٹ کی تھی۔ میں نے ایئرپورٹ میں ہی پہچان لیا تھا کہ وہ تصویر آپ کی تھی اور رشتہ داروں میں کچھ میری سہیلیاں بھی ہیں جو آپ کے

بارے میں بتاتے ہوئے کہہ رہی تھیں... کہ آپ اس رشتے سے راضی نہیں ہیں... بڑی مشکل سے آپکو منایا گیا ہے... آخر کونسی ایسی بات تھی کہ منتوں سے آپ مانیں... شاید مجھ سے بات چیت کر کے پرکھنا چاہتے تھے... تو کیا یہ صرف آپ کا ہی حق ہے... کیا لڑکی کا کوئی اختیار نہیں کہ وہ چھان بین کر کے رشتہ طے کریں... میں نے بچپن سے امریکہ میں آنکھ کھولی ہے... مگر اباؤ اجداد پاکستانی ہیں... یہاں کا رہن سہن... طور طریقوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں... آپ سوچیں ایک کھلی فضا میں پودا رکھا جائے تو وہ خوب پھلتا پھولتا ہے اگر بند فضا میں اس کو رکھ دیا جائے تو وہ مرجھا جائے گا۔ یہی حال امریکہ اور پاکستان کا ہے... صرف فضا کا فرق ہے... آپ بہت اچھے انسان ہونگے باہر کی دنیا میں پڑھ لکھ کر آئے ہیں۔ عام لوگوں سے بہتر ہونگے اس میں کوئی شک نہیں ہے... مگر میں افسوس سے کہوں گی... میں جس سرزمین کا پودا ہوں وہیں پر وہ پھلتا پھولتا ہے۔

چلتی گاڑی میں ہوا کا جھونکا آیا... ڈیش بورڈ پر گلاب کے پھول ایئر کنڈیشن گاڑی میں خوشبوؤں سے ہمکنار ہو رہے تھے... چار سو خوشبو کا جال بچھا ہوا تھا... ارسلان دل ہی دل میں اس پر رحم کھا کر اس سے شادی کر رہا تھا اپنے آپ کو قربان کر رہا تھا... شاید وہاں رشتوں کی کمی ہے مگر... باہر ہواؤں میں ریلی نرمی آچکی ہے۔

گہرے سبز مخملی گھاس پر کرسیاں بچھی تھیں، درختوں کی شاخوں اور منڈیروں پر قمقمے روشن تھے... ارسلان غیر شعوری طور پر خزاں زدہ پھول کی مانند پژمردہ نظر آ رہا تھا... اس کی رگوں میں خون جمتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بہت ناز نخرے دکھا کر منگنی رچانے والا لڑکا... ایک لڑکی کے خیالات سن کر دلبرداشتہ ہو جائے گا۔

وہ گاڑی سے اتر کر ارسلان کے ساتھ خراماں خراماں چلتے ہوئے... جھیل جیسی آنکھیں، گلابی ہونٹ، پھول کی مانند پنکھڑیوں جیسے گال... اپنی دھن میں مست لوگوں پر بجلی گراتی ہوئی سب کے قریب سے گزر رہی تھی۔ ایسی کشش تھی کہ ارسلان کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی خوشبو ہے... جو دل و دماغ میں چھا گئی ہے... احساس کی گہرائیوں میں ایک انوکھی سی چبھن دامن گیر تھی... ایک محرومی تھی... اس نے کیا اس پر رحم کھانا تھا وہ خود قابل رحم تھی۔

☆☆☆☆☆

مرجانی

نیلم احمد بشیر

مجھے سیب کھانے کا بہت شوق ہے۔ روز کتنی اقسام اور کوالٹی کے سیب خرید کر لاتی ہوں۔ انھیں اہتمام سے کاٹتی ہوں اور پلیٹ میں سجا کر کھاتی ہوں۔ مگر ہر دفعہ میں یہی سوچتی ہوں خوامخواہ میں کھایا..... مزا نہیں آیا۔ نہ ہی کھاتی تو کیا تھا۔ پھر مجھے وہ یاد آجاتی ہے۔ کالج میں میرے ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی آج جس کا نام بھی میرے ذہن سے محو ہو چکا ہے۔

گول چہرہ، صحت مند جسم، فیشن ایبل انداز میں کٹے ہوئے بال، کرتہ اور چست پاجامہ زیب تن کیے ہوئے وہ ہنستی مسکراتی، زندگی سے بھرپور لڑکی مجھے کبھی بھولی نہیں۔ اس کے چہرے مُہرے اور شخصیت کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کسی آسودہ خاندان سے اس کا تعلق ہے۔ میں اور میری چند سہیلیاں مڈل کلاس لڑکیاں تھیں۔ جہاں ماں باپ بڑی مشکل سے ہماری فیسیں اور اخراجات پورے کرتے تھے۔

کالج میں بریک ٹائم ہوتا تو ہم سب لوگ پیسے جمع کرتے اور چاٹ والے سے ایک

دو چاٹ کی پلیٹیں لے لیتے اور مل بانٹ کر کھا لیتے۔

وہ کینے ٹیریا میں بیٹھ کر سموسے لیتی اور کوک پیتی۔ پھر بیگ میں سے نکال کر خوبصورت، خوشبودار، خوش ذائقہ رسیلے سیب نکال کر ان میں دانت گاڑھ دیتی ہم نے اسے کبھی کبھار یہ بھی کہتے سنتے An Apple a day keeps the doctor away

تبھی سے مجھے سیبوں سے محبت ہوگئی۔ شاید اس لیے بھی کہ ہمارے گھر میں سیب یا دیگر میٹھے پھل آتے نہیں تھے۔ کبھی کبھار امرود، آم یا خربوزہ آتا تو بھائی اور بہنیں بندروں کی طرح فوراً ہی کھا پی کر برابر کر دیتے۔ سیب کھانے کی مجھے حسرت ہی رہی۔ اس کی اور میری کلاس میں بہت فرق تھا۔ میں پبلک بس میں آتی جاتی اور وہ ایک باوردی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں اُترتی اور شان سے چلتی ہوئی کالج میں داخل ہوتی۔ پڑھائی میں البتہ میں اس سے بہت بہتر تھی۔ یعنی لائق فائق اچھے نمبر لینے والی۔

میں اور میری سہیلیاں اکثر کینے ٹیریا کی کرسیوں پر بیٹھ کر امیر لڑکیوں کی چھوڑی ہوئی کوک اور سموسوں کے ٹکڑوں پر نظر جمائے رہتے۔ جیسے ہی وہ اُٹھ کر جاتیں ہم بھاگ کر اس کی میز پہنچتیں اور بچا کھچا کھا پی کر قہقہے لگانے لگ جاتیں۔ وہ اپنے خوبصورت کھلتے ہوئے فیشن ایبل انداز میں کٹے بال لہراتی سیب کھاتی تو مجھے اس سے بڑی جلن محسوس ہوتی۔ میں دل ہی دل میں بڑبڑاتی "مرجانی سیب کھاتی کتنی بے نیاز مگر اچھی لگتی ہے۔'

پھر کالج کا دور ختم ہوگیا۔ یونیورسٹی میں بھی پڑھائی مکمل ہوئی اور وقت دبے پاؤں گزرتا گیا۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں میں سیٹل ہوگئے۔

ہم ہر بات بھول گئے مگر مجھے اپنی اعلیٰ رسیلے سیب کھانے کی حسرت ہمیشہ یاد رہی۔ کئی بار اچھے سے اچھا سیب لائی مگر کوئی خاص مزا نہ آیا۔ جیسا سوچا تھا ویسا تو سیبوں کا سواد نہ تھا۔ وہ لڑکی مجھے کبھی نہ بھولی۔ حالانکہ بھول جانی چاہیے تھی۔ کئی دہائیاں گزر گئیں مگر اس کا خیال ذہن سے چپکا رہا۔ مرجانی کالج کے آخری سال میں ہی کینسر کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گئی تھی مرنے سے پہلے اس کے ارد گرد کتنے ڈاکٹروں کا جمگھٹا رہا ہوگا..... حالانکہ وہ اتنے سیب کھاتی تھی.....

☆☆☆☆☆

اصلی گھر

مرزا بشیر الدین کو خدا نے ہر نعمت سے بخوبی نواز رکھا تھا۔ وہ خاندانی امیر نہ تھے تاہم اتنا ضرور تھا کہ انھوں نے اپنے دادا اور اس کے بعد اپنے والد کی دولت اور ثروت میں اتنا اضافہ ضرور کر لیا تھا کہ اب ان کا شمار بھی شہر کے بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ ان کی عالی شان کوٹھی بھی شہر کے انتہائی متمول علاقے میں تھی۔ یہاں گلیوں کے بجائے کشادہ سڑکوں کا اک جال سا بچھا ہوا تھا اور صاف ستھرے محلے مختلف فیزوں میں منقسم تھے۔ ان کی کوٹھی فیز ون میں تھی جہاں بسنے والے سب لوگ دیگر فیزوں کی نسبت زیادہ امیر تھے۔ فیز ٹو میں بسنے والے لوگ کم امیر تھے اور اس طرح آخری فیز تک امارت کی یہ درجہ بندی کم تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کے باوجود آخری فیز میں رہنے والے لوگ بھی خاصے امیر تھے۔ ہر گھر کے گیراج میں دو تین گاڑیاں کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک ماڈل کی عالی شان گاڑی کا شوق شہر کے ہر رئیس کو تھا۔ مرزا بشیر الدین کے شوق البتہ دیگر رئیسوں سے کسی قدر مختلف تھے۔ انھیں مہنگی سپورٹس کاروں کا شوق تھا جو عرب شہزادے استعمال کرتے تھے۔ مرزا نے بھی یہ شوق عرب سے ہی پایا جہاں وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر و بیشتر آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک شہزادے سے راہ و رسم اس حد تک بڑھی کہ وہ ایک دن مرزا صاحب کو اپنی خصوصی سپورٹس کار میں گھمانے لے گیا۔ راستے میں ہر شخص نے کم از کم ایک بار تو گردن گھما کر گاڑی کی طرف ضرور دیکھا اور جو ایک بار دیکھتا وہ پھر دیکھتا ہی چلا جاتا۔ لوگوں کے یوں ٹک ٹک دیکھنے سے عرب شہزادہ عجیب سا احساس تفاخر محسوس کرتا۔ شروع میں مرزا بشیر الدین کو کچھ محسوس نہ ہوا لیکن پھر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے انھیں لگنے لگا کہ لوگوں کے دیکھنے کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ جیسے مرزا بشیر الدین گاڑی کے مالک ہیں اور چلانے والا عرب شہزادہ محض ڈرائیور۔ اس احساس برتری یا احساس تفاخر نے مرزا بشیر الدین کو

انعام الحسن کاشمیری

بھی ایسی ہی مہنگی ترین گاڑی خریدنے کے شوق میں مبتلا کر ڈالا۔ ذاتی طور پر ان کے پاس جدید ترین ماڈل کی کئی گاڑیاں موجود تھیں لیکن وہ سب ملا کر بھی عرب شہزادے کی ایک سپورٹس کار کا مقابلہ نہیں کر پاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا بشیر الدین جب وطن واپس آنے لگے تو انہوں نے ایسی ہی ایک گاڑی بھی بک کروالی۔

اب مرزا جب بھی گھر سے باہر نکلتے تو لوگ انہیں ترسی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے۔ گردنیں گھمانے والے گھما گھما کر دیکھتے اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والوں کی آنکھوں کی پیاس کبھی نہ بجھتی۔ گاڑی کے چاروں سائلنسروں سے نکلنے والی عجیب قسم کی چنگاڑ سے مرزا کو خوب طمانیت میسر آتی۔ وہ جب ریس کے پیڈل پر خوب زور ڈالتے تو سائلنسر پھڑ پھڑانے لگتے۔ اور ان کی دموں سے جو عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکلتیں، یہ کسی جہاز کے انجن کی معلوم پڑتی تھیں۔ چنانچہ مخصوص چنگھاڑ کی وجہ سے مرزا کی گاڑی دور سے آتے ہوئے صاف طور پر پہچان لی جاتی تھی۔

اس گاڑی نے علاقے بھر میں مرزا کی خوب دھاک بٹھا رکھی تھی۔ صرف علاقے میں ہی نہیں شہر کی بڑی سڑکوں پر بھی گاڑی دوڑاتے ہوئے انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ سڑک پر گاڑی نہیں، جہاز چلا رہے ہیں۔ دوسری گاڑیوں میں بیٹھے لوگ شیشوں سے اچک کر ان کی طرف دیکھا کرتے اور پھر اپنے دلوں میں ایک نئی قسم کی حسرت کی نمو پاتے۔ ایسی حسرت کی نمو جس کی تکمیل ہر کسی کے لیے ممکن نہیں ہو پاتی۔ جو لوگ اپنی تشنہ خواہشوں کو سیراب کرتے کرتے تھی دست رہ جاتے ہیں وہ اس کا الزام معاشرے پر دھر دیتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ اسی معاشرے میں وہ لوگ بھی رہتے ہیں جن کی گھڑی کی ٹک ٹک کرتی ہر سوئی ان کی دولت اور امارت میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے اور ہر اٹھتے قدم کے ساتھ ان کی اڑان اور اٹھان از خود بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مرزا بشیر الدین بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

چند ہی برسوں میں مرزا بشیر الدین کے احساس تفاخر نے انہیں تین مہنگی سپورٹس کاروں کا مالک بنا دیا۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے گھر کا نقشہ بھی مقامی ثقافت سے ہٹ کر بنایا ہوا تھا۔ یہ خالصتاً غیر ملکی نقشہ تھا۔ گیراج، بیڈ روم، باتھ، راہداریاں، نچلی و بالائی منزل غرض ہر کونے کھدرے کی تعمیر کا ڈیزائن ماہر غیر ملکی سول انجینئروں سے تیار کروایا گیا تھا۔ گھر کی استعمال ہونے والی اکثر اشیاء مثلاً دروازے، قیمتی پتھر، سنگ مرمر اور ٹائلیں دنیا کے مختلف ممالک سے منگوا کر لگائے گئے۔ مرزا کا ذاتی کمرہ ایک بہت بڑے ہال پر مشتمل تھا جس کے بغل میں مزید تین کمرے تھے۔ یہ تینوں کمرے مختلف مقاصد کے لیے استعمال میں لائے جاتے۔ ڈرائنگ روم میں لگے فانوس

بھی یورپ سے منگوا کر لگائے گئے تھے۔
امارت کے اظہار کا کوئی ایک نمونہ ایسا نہیں تھا جو مرزا نے اختیار نہ کیا ہو۔ اور شہر کے دیگر متمول گھرانوں اور رئیسوں کی شان و شوکت کو ماند کرنے کے لیے کوئی ایسا حربہ نہیں تھا جو مرزا کی رسائی میں آنے سے محفوظ رہا ہو۔ دنیا کی ہر آسائش جو کہیں سے بھی میسر آسکتی تھی، مرزا کے گھر میں دستیاب تھی۔ یہ گھر نہ تھا بلکہ ایک عظیم الشان محل تھا جس کا داخلی دروازہ پار کرتے ہی حیرت و استعجاب کے نئے در ہر لحہ وا ہونے لگتے۔ یہاں پہنچ کر امکانات کی پرانی فصیلیں معدوم ہو جاتیں اور ان کی جگہ محل کی بلند ہوتی بنیادیں لے لیتیں جن کی ہر اینٹ پر مرزا کی ذاتی لگن اور شوق کی گہری مہر ثبت تھی۔

شہر کے ہر رئیس گھرانے سے مرزا کے ذاتی تعلقات تھے۔ چنانچہ ان تعلقات کو سرد مہری سے بچانے کے لیے اس محل میں ہر کچھ عرصے بعد شاندار محفلوں کا انعقاد کیا جاتا۔ ان محفلوں سے تعلقات میں گرم جوشی بڑھ جاتی اور شہر میں مرزا کی اس دعوت خاص کے خوب چرچے بھی اگلے کئی ہفتوں اور مہینوں تک جاری رہتے۔ اس نمود و نمائش کے لیے مرزا باقاعدہ منصوبہ بندی سے کام لیتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے دو مشیر مقرر کر رکھے تھے جو ہر نئے زاویے سے جانچ پرکھ کر بتاتے کہ کس نوعیت کا اقدام مرزا بشیر الدین کی شان و شوکت کو مزید چار چاند لگانے کا سبب بن سکتا ہے۔ ایسے مشورے پر بخوبی عمل پیرا ہونا مرزا کے لیے حرز جاں کی نوعیت رکھتا تھا۔ یہ حرز جاں زندگی کے ایک بڑے حصے پر خوب حاوی رہا یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ پورے شہر میں مرزا کے نام کا ڈنکا بجنے لگا اور ان کی امارت، ثروت، عیاشی، طبقہ خاص کے لیے سخاوت، نفاست اور جاہ و جلال کا شہرہ چہار دانگ عالم میں پھیل گیا۔ شہر کا کونہ کونہ اور اس کونے میں رہنے والا ہر شخص جانتا تھا کہ مرزا بشیر الدین کون ہیں؟ کسی سے اگر ان کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ پہلی ہی سانس میں جواب دیتا۔ اچھا آپ ان مرزا بشیر الدین کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو کئی کنال پر محیط عالی شان محل میں رہتے ہیں اور جن کے پاس بہت سی سپورٹس کاریں ہیں اور سوال پوچھنے والا گردن ہلاتے ہلاتے کہتا۔ ہاں---ہاں---وہی مرزا صاحب!!!!

مرزا صاحب ابھی پچاس برس کے بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ایک دن ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ مقامی ہسپتال لے جایا گیا تو پتا چلا کہ بلڈ پریشر بہت زیادہ رہنے کے باعث خلجان قلب کی تکلیف ہوئی ہے۔ پورے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ مرزا کو علاج کے لئے شہر کے سب سے مہنگے نجی ہسپتال لے جایا گیا جو شہر کے انتہائی پوش علاقے میں واقع تھا۔ وہاں ایک بڑا کمرہ کرائے لے پر لیا گیا۔ انتظامیہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ

مرزا کے علاج کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرے اور تن دہی و جانفشانی اور فرض کی ادائی کی جو بھی آخری حد ہو سکتی ہے، اُسے یہاں بروئے کار لایا جائے۔ روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ ایک ہی ہفتے میں لاکھوں روپے خرچ ہو گئے۔ یہ سارے اخراجات مرزا کے لیے زیرہ برابر حیثیت رکھتے تھے۔ بیوی بچے اور قریبی عزیز متمنی تھے کہ کچھ بھی ہو بس مرزا کو جلد صحت یاب ہو جانا چاہیے۔ اول جو کمرہ کرائے پر لیا گیا، تیمارداروں کی کثیر تعداد میں آمد کی بابت اسے تبدیل کر دیا گیا۔ اب مرزا کا کمرہ ایک پوری وارڈ کے برابر تھا جہاں ہر قسم کی سہولیات بہم پہنچائی گئی تھیں۔ یہاں ایک وقت میں کئی کئی لوگ مرزا کے قریب رہ سکتے تھے۔ ہر وقت صبح سے شام تک شہر کے بہت سے معززین اور دیگر سرکردہ افراد ہمہ وقت مرزا کی عیادت کے لیے ہسپتال میں آمد و رفت جاری رکھتے۔ شہر کے سب شرفاء کو اپنی مزاج پرسی کے لیے اپنے قریب پا کر مرزا بے حد مسرور ہوتا اور اس کی گردن فخر سے تن جاتی۔ کبھی کبھی اسے خیال گزرتا کہ ہمیشہ کے لیے ہسپتال میں ہی رہ جانا چاہیے تا کہ شہر کے شرفا، ضلعی انتظامیہ اور حکومت کے لوگ، بڑی بڑی فیکٹریوں اور کمپنیوں کے مالکان اور دیگر امیر لوگ یونہی اس کی عیادت کے لیے حاضر ہوتے رہیں اور ان لوگوں کے ساتھ اس کے خصوصی تعلقات زیادہ پائیدار ہوتے رہیں لیکن ہر ایسی خواہش پر دم نکلنے کا امکان مرزا کی بساط میں نہ تھا۔

ایک ہفتے بعد ہی مرزا کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ اس تمام عرصے میں اس پر بخوبی عیاں ہو گیا کہ اس کے تعلقات کس قسم کے لوگوں کے ساتھ ہیں اور یہ کہ وہ سب مرزا کی بیماری سے کسی قدر پریشان رہے۔ چنانچہ جب مرزا ٹھیک ہو کر گھر تشریف لائے تو انہوں نے عظیم الشان جشن صحت یابی منانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے اپنے ذاتی مشیروں و خدمت گاروں اور اہل خانہ سے بھرپور مشاورت کی گئی۔ شہر کے معززین، بڑے بڑے شرفا، سرکاری افسروں، نامی گرامی ڈاکٹروں، ججوں، معروف سیاستدانوں، اور صوبائی حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں کی فہرستیں دن رات تیار کی جاتی رہیں۔ آخر ایک ماہ کی مسلسل تیاریوں اور تگ و دو کے بعد کہیں جا کر مرزا اور ان کے مصاحب اس قابل ہوئے کہ فہرست کنندگان کو دعوت نامے ارسال کر سکیں۔ کھانوں کی تیاری کے لیے شہر کے معروف باورچیوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جس دن یہ جشن صحت یابی منعقد ہوا اس دن پورے علاقے میں ہر جگہ مرزا کے مہمانوں کی گاڑیوں کی طویل قطاریں تھیں اور شہر کے سب معززین اور بڑے لوگوں کا رخ مرزا کے گھر کی جانب تھا۔ کئی

ہفتوں اور مہینوں ہی نہیں برسوں لوگ مرزا کی اس دعوت کے تذکرے کرتے رہے۔ اخبارات نے اس تقریب کی خوب تصاویر شائع کیں۔ مقامی چھوٹے اخبارات نے جشن کے باقاعدہ ایڈیشن چھاپے۔ یہ ساری خبریں، تصویریں اور ایڈیشن مرزا نے ایک بڑا فریم بنوا کر اس میں محفوظ کر لیے تھے۔ چنانچہ جب بھی کوئی بڑی شخصیت مرزا سے ملاقات کے لیے تشریف ہوتی تو مرزا اسے یہ فریم دکھا کر اپنی بڑائی اور اپنی شان و شوکت کے عملی اظہار کا نادر نمونہ ضرور دکھاتے اور دیکھنے والا مرزا کی شخصیت، رعب وداب اور ان کی شان وشوکت سے اور زیادہ مرعوب ہو جاتا۔

مرزا کا معمول تھا کہ ہر سال عید سے قبل شہر کے غریب اور مستحق لوگوں میں کپڑے اور دیگر اشیاء تقسیم کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ایک مہینے تک جاری رہتا۔ مردوں اور عورتوں کی قطاریں صبح سویرے ہی لگ جاتیں۔ مرزا اپنی خواب گاہ سے باہر تشریف لاتے اور ایک بادشاہ کی طرح پہلے اپنے ہاتھوں سے چند مردوں اور چند عورتوں میں یہ خیرات تقسیم کرتے اور اس کے بعد واپس اپنے کمرے میں چلے جاتے جہاں کھڑکی میں کھڑے ہو کر اپنے ملازموں کے ہاتھوں سے سامان تقسیم ہوتا دیکھتے رہتے۔ اس سارے عمل سے مرزا کو یہ محسوس ہوتا کہ جیسے وہ بہت بڑے انسان ہیں اور قدرت نے انہیں کسی خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ یہ بھی خیال کرتے کہ اگر وہ پیدا نہ ہوتے تو ہر سال عید پر شہر کے ہزاروں غریب لوگ خوشیوں سے محروم رہ جاتے۔

مصاحب اور عزیز دوست جب مرزا سے ذکر کرتے کہ فلاں محفل میں مرزا کی دریا دلی اور ان کی نیک نامی کا کس طرح بھرپور تذکرہ کیا گیا ہے، تو مرزا کا وجود ڈھیلا پڑ جاتا۔ وہ کرسی کی پشت پر گردن ٹکا لیتے اور آنکھیں میچ کر تصور کرنے لگتے کہ جیسے وہ خود اس محفل میں موجود ہیں اور وہاں لوگوں کی زبانوں سے براہ راست اپنی تعریف و توصیف سن رہے ہیں اور ہر گزرے سال کے ساتھ اس رطب اللسانی میں اضافہ ہو جاتا اور مرزا کا نام کچھ اور پھیل جاتا بالکل اسی طرح جس طرح سورج جب بڑھتا ہے تو اس کا سایہ بھی دراز ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ بڑھتے بڑھتے پھر ایسے نکتہ پر جا پہنچتا ہے کہ جہاں سے یہ بڑھنے کے بجائے ڈھلنے لگتا ہے اور یہی کچھ مرزا بشیر الدین کے ساتھ بھی ہوا۔

زندگی جس ڈھب سے گزر رہی تھی یہ باقی نہ رہا۔ عروج کی وہ داستان جو ہر لحظہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی آخر کار اس میں روک آئی۔ مرزا بشیر الدین کے مراسم ہر اس فرد کے ساتھ بخوبی استوار ہو چلے تھے جو کسی بھی درجے میں کوئی اثر رسوخ اور حیثیت رکھتا تھا۔ اب شہر میں کوئی ایسا فرد باقی نہ رہا تھا جو

مرزا کے حلقہ یاراں میں شامل نہ ہو۔

ایک شام مرزا کے سینے میں درد اٹھا تو انہیں فوری ہسپتال لے جایا گیا۔ یہ وہی ہسپتال تھا جہاں اس سے پیشتر مرزا کو اختلاج قلب کی تکلیف میں مبتلا ہونے کے باعث لایا گیا تھا۔ پہلی بار داخلے کے وقت مرزا نے ہسپتال کے مالکان اور اس کے دیگر عہدیداروں کے ساتھ خصوصی مراسم قائم کر ڈالے تھے اور ان لوگوں کو جشن صحت یابی میں بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ چنانچہ ہسپتال میں اس مرتبہ بار خصوصی التفات کی گئی اور باہمی تعلق کی بڑھتی ہوئی حدت سے مرزا کی خوب خدمت کی گئی۔ تیمارداری و مزاج پرسی کے لیے آنے والے حکام و افسران کا ہمہ وقت تانتا بندھا رہتا۔ شہر کے معززین اور شرفا کا ہمہ وقت ہجوم بے کراں ہسپتال کے اندر اور باہر موجود رہتا۔ مرزا کے سارے گھریلو ملازمین اور مصاحب دن رات ان کی خدمت میں لگے رہتے۔ ان لوگوں کے لیے مرزا کے کمرے کے ساتھ ہی کئی کمرے مختص کر دیے گئے تھے۔ کئی دن اور کئی ہفتوں تک ہسپتال میں ایک ہنگامہ بپا رہا۔

ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود مرزا کی طبیعت نہ سنبھل سکی تو بیرون ملک سے ماہر ڈاکٹر بلائے گئے۔ ساری رپوٹوں، علاج معالجے اور مہنگی ترین ادویات کے باوجود دو ماہ تک ہسپتال میں رہنے کے بعد ایک دوپہر مرزا نے آخری ہچکی لی اور ان کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ قریب موجود ایک ذاتی خدمت گار نے ہاتھ بڑھا کر ان کی کھلی آنکھیں بند کیں اور چہرے پر چادر ڈال کر دوسرے کمرے میں موجود مرزا کے بیوی بچوں کو اطلاع دینے دوڑ پڑا۔ یہ مرزا کا انتہائی قابل اعتماد اور مخلص ذاتی ملازم تھا جو ہمہ وقت ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اب جب مرزا نے آخری سانسیں لیں تو حسن اتفاق سے یہی ملازم مرزا کے پاس موجود تھا۔ اس کے بین ہسپتال کے در و دیوار سے نکل رہے تھے اور اس کی گلا پھاڑ کر رونے کی آوازوں نے چرند پرند کو بھی اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ یونہی بین کرتے کرتے جب دوسرے کمرے کے دروازے تک پہنچا تو اس نے کمرے سے آتی بلند آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں مرزا کی بیوی، بیٹیوں، بیٹوں اور بہوؤں کی تھیں جو ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے، جھگڑ رہے تھے اور اپنے مقام، حیثیت اور مرتبہ کا رعب جھاڑ رہے تھے۔ ملازم جو دکھ اور غم سے ہلکان ہو رہا تھا، اور بلند آواز میں رونے کی وجہ سے جس کا گلا بیٹھ گیا تھا، اور اب مزید اونچی آواز میں بین کرنے کے قابل نہ رہا تھا، کے قدم دروازے پر ہی رک گئے۔ اس نے اپنے حلق کی خراش کو آنسو پی کر دور کرنے کی کوشش کی اور چوکھاٹ کی اوٹ میں رہتے ہوئے دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔

بڑے بیٹے اپنے چھوٹے بھائیوں سے

لڑ رہے تھے اور جنہیں کسی تمیز اور لحاظ کے بغیر اپنے بھائیوں سے بازی لے جانے کی کوشش میں تھیں اور ان کی ماں کی غم گیر آواز ان چیخوں میں دب کر رہ گئی تھی جو اس وقت بلند ہوتی جب کمرے میں موجود باقی لوگ کسی لمحے خاموش ہو جاتے۔ ان سب کا جھگڑا فطرت کا عکاس تھا۔ یہ فطرت وہی ہے جو دولت مندوں، بڑی بڑی جائیداد کے حامل لوگوں اور بڑے بڑے محلات اور کوٹھیوں میں رہنے والوں کے ہاں جنم لیتی ہے اور پھر باقی لوگ اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ یہ ازلی المیے ہیں اور اسی ازلی پن کے ساتھ تا ابد جاری رہیں گے۔ چنانچہ ادھر مرزا بشیر الدین کی آنکھیں بند ہونے کے قریب ہوئیں، ادھر بغلی کمرے میں مرزا کے خونی رشتہ دار کہ جن کی نمو اور جن کے بڑھاوے میں مرزا نے اپنی زندگی نچھاور کر دی تھی اپنی ہوس اور اپنی حرص کی بھرپور نمائش جاری رکھے ہوئے تھے اور جائیداد کے بٹوارے اور ہر چیز کے جو مرزا کو بے حد عزیز تھی، کی تقسیم کے متمنی تھے اور چاہتے تھے کہ ابھی اور اسی وقت ہم آپس میں سب معاملات طے کرلیں۔ ہر اچھی چیز اور زیادہ حصہ لینے کے لالچ کے باعث معاملات آسانی سے طے نہیں ہوتے۔ ان کو حل کرنے کی کوششوں کے دوران ہی جھگڑے جنم لیتے ہیں اور پھر یہ جھگڑے رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتے ہیں اور تعلقات میں گہری خلیج حائل کر دیتے ہیں۔

ملازم نے جلدی سے دروازہ کھولا اور بمشکل حلق میں سے آواز نکال کر مرزا بشیر الدین کے فوت ہو جانے کی اطلاع دی۔ ایک دوسرے پر چیخنے والے لوگ یک دم خاموش ہو گئے۔ ان کے چہروں پر حزن و ملال کے بادل چھا گئے اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔۔ مرزا کی بیٹیاں "ہائے ابا جان" کی صدا لگاتے باہر کی جانب دوڑ پڑیں۔ لمحہ بھر میں ہسپتال میں افراتفری مچ گئی۔ طبی عملے کا ہر رکن اور انتظامیہ کا ہر فرد اس جانب رخ کیے ہوئے تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہسپتال کے باہر عالی شان گاڑیوں کی طویل قطاریں لگ گئیں۔ کروفر والے کتنے لوگ تھے جو اپنے اکڑے ہوئے ملبوسوں کی نمائش کرتے، غم ناک صورت بنائے ہسپتال کی راہداریوں اور برآمدوں میں کھڑے تھے۔ ہر شخص مرزا کی وفات پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ ہسپتال کی ضروری کارروائی مکمل ہو جانے کے بعد جب مرزا کی نعش باہر نکالی گئی تو ہسپتال کے سامنے اور اطراف کی ساری سڑکیں ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے بند ہو چکی تھیں۔ آخر ٹریفک پولیس کے کافی سارے اہلکاروں نے دو گھنٹے کی تگ و دو کے بعد اتنا راستہ بنایا کہ ایمبولینس نکل سکے۔ ایمبولینس نکلنے کے آدھ گھنٹے بعد ہی یہ ساری سڑکیں اور گلیاں بھی سنسان و ویران ہو گئیں جیسے یہاں کبھی

کوئی گاڑی موجود ہی نہیں تھی۔ مرزا کی نعش کے ساتھ ہی سارا ہجوم بھی چھٹ گیا۔

مرزا کے بڑے سے محل میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ برآمدوں، کمروں، راہداریوں، پائیں باغ، گھر کے باہر سڑک پر اور سڑک کے باہر کھلی جگہوں پر ہر جگہ لوگ ہی لوگ موجود تھے۔ یہاں ٹریفک پولیس نے پہلے ہی گاڑیوں کا علاقے میں داخلہ بند کر دیا اور انہیں کھڑی کرنے کے لیے قریب سے منسلک پارک کو منتخب کیا گیا۔ پارک میں جب جگہ باقی نہ رہی تو دھیرے دھیرے ایک کے بعد دوسری کے پیچھے لگتے لگتے گاڑیوں کی قطار طویل ہوتے ہوتے ہر سڑک پر پھیل گئی۔ لوگ تھے کہ آتے جا رہے تھے۔ ہر شخص ایک سے بڑھ کر ایک بڑی اور قیمتی گاڑی پر سوار تھا۔ وزراء، مشیران اپنے پورے عملے کے ساتھ آن پہنچے اور اسی طرح درجہ بدرجہ باقی لوگ بھی۔ ضلعی حکام میں باقی کوئی ایسا نہ بچا تھا جو آیا نہ ہو اور شہر کا کوئی ایسا رئیس اور دولت مند باقی نہ رہا جو مرزا صاحب کے جنازے میں شرکت سے محروم رہا ہو۔

"بڑے بڑے ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ مہنگی سے مہنگی دوائی کھلائی اور پیسہ پانی کی طرح بہایا لیکن افسوس ----" مرزا کا بڑا بیٹا پرسا دینے والے ہر فرد کی چھاتی سے لگ کر غم گیر لہجے میں اپنا دکھڑا سناتا اور سننے والا دلاسہ دیتے ہوئے اتنا ہی کہہ پاتا "بس ---- خدا کی یہی مرضی تھی۔"

مرزا کی زندگی کی طرح اس کی موت بھی شاندار ہوئی اور تجہیز و تدفین کے انتظامات اس سے بھی زیادہ شان و شوکت سے ہوئے۔ جب میت جنازگاہ میں لائی گئی تو کتنے لوگ ایسے تھے جنہیں میت کو کندھا دینے کا موقع نہ مل سکا۔ جنازگاہ بھر گئی تو باہر سڑک پر صفیں بنا لی گئیں اس کے باوجود بہت سارے لوگ نماز جنازہ پڑھنے سے محروم رہ گئے۔ نماز جنازہ کی ادائیگی سے قبل امام صاحب نے مرزا صاحب کی حیات و خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس مختصر سے تعزیتی ریفرنس میں مرزا کی زندگی اور معاشرے کے لیے ان کی خدمات کا کھل کر ذکر کیا گیا۔ ٹی وی چینلوں اور اخبارات کے رپورٹروں کی بڑی تعداد جنازہ کی کوریج کرنے کے لیے موجود تھی۔ صبح جب مرزا نے زندگی کی آخری سانسیں لیں تو اسی وقت ٹی وی پر کسی نے خبر چلا دی کہ شہر کے سب سے بڑے رئیس، نصف درجن سپورٹس کاروں کے مالک، قیروان کے سب سے عالی شان محل کے مکیں اور ہر سال شہر بھر میں سب سے پر تکلف تقریب منعقد کرنے والے میزبان مرزا بشیر الدین وفات پا گئے ہیں۔ دھیرے دھیرے اس خبر میں مرزا کی زندگی کے حالات و واقعات کا تڑکا بھی لگتا گیا۔ کچھ دیر بعد اس تڑکے میں دیگر چیزوں کی آمیزش ہونے لگی اور شام تک مرزا کی شخصیت کے سارے اسرار

ورموز، اُن کی زندگی کے سارے کمالات اور ان کے سارے تصورات پر وہ سکرین کے ذریعے عوام تک پہنچ گئے۔

تدفین کے لیے مرزا کی میت کو آخری فیز سے متصل قبرستان میں لے جایا گیا، جو اس علاقے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ یہاں ایک مناسب جگہ دیکھ کر قبر تیار کرائی گئی تھی۔ جب مرزا کا جسدِ خاکی قبر میں اتارا گیا تو رقت آمیز مناظر تھے۔ مرزا کے اہلخانہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور باقی لوگ غم و یاس کی کیفیت میں مبتلا انتہائی رنجیدہ و رنجور دکھائی دے رہے تھے۔ شام ہونے سے پہلے مرزا منوں مٹی تلے دفن ہو گئے۔ بیٹوں نے خود ہی میت قبر میں اتاری تاہم اوپر سلیبیں جوڑنے اور مٹی ڈالنے کا کام گورکنوں نے ہی کیا۔ بعد میں مولوی صاحب نے تلاوت کی، پھر دعا اور اس کے بعد سب لوگ آہستہ آہستہ گھروں کو لوٹنے لگے۔ مرزا کے بیٹے البتہ قبر کے پاس ہی موجود رہے۔ جب ہجوم چھٹ گیا اور سوائے گورکنوں کے اور کوئی باقی نہ رہا تو مرزا کے بڑے بیٹے نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ قریب ہی ایک تازہ قبر ہی موجود تھی جس پر پانی کے چھڑکاؤ اور گیلی مٹی کی وجہ سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ ایک آدھ دن پہلے ہی بنائی گئی ہے۔

یہ کس کی قبر ہے؟ مرزا ناصر نے ایک بوڑھے گورکن کو پیسے دیتے ہوئے بے دھیانی سے پوچھا۔

"کوئی نہیں صاحب! فیزون میں رہنے والے ایک شریف آدمی تھے۔ کل صبح ہی وفات پائی تو شام کو یہاں دفنا دیا گیا۔" گورکن نے قبر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا----" یہ کہہ کر مرزا ناصر نے اپنے بھائیوں کے ساتھ قدم قبرستان کے گیٹ کی طرف بڑھا دیئے۔

"تم نے مرزا کے بیٹے سے جھوٹ کیوں بولا؟" مرزا ناصر اور باقی لوگوں کے جاتے ہی ایک دوسرے گورکن نے اپنے بوڑھے ساتھی سے کہا، جو اب کدال کندھے پر رکھے واپسی کے لئے قدم بڑھانے والا تھا۔

"تو میں سچ کیسے بتا دیتا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ قبر ایسی جگہ تیار کرنا جہاں صرف فیزون کے بڑے لوگوں کی ہی تدفین کی جاتی ہو۔ اب میں انہیں کیسے بتلاتا کہ یہ قبر اس غریب شخص کی ہے جو کل ہی خیراتی ہسپتال میں مرا ہے اور انتظامیہ نے اسے یہاں لاکر دفنایا ہے۔" یہ کہہ کر بوڑھے نے قدم آگے بڑھا لیے۔ ایک ٹکری سے اترنے کے بعد وہ کچھ لمحوں کے لئے رکا، مرزا کی قبر کے اردگرد بکھری مٹی کو ٹھکانے لگانے میں مصروف دیگر گورکن ساتھیوں کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔

"زندگی چاہے جتنی بھی ہو اور جیسی بھی گزری ہو، مرنا آخر سب نے ہی ہے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ قبر اندر سے سب کی ایک جیسی ہی ہوتی ہے ---- ہر امیر غریب کا ایک جیسا اصلی گھر!!!"

☆☆☆☆☆

چوری

ساری رات وہ کھانستا رہا، اور اُس کی کھانسی بڑی شدید تھی، کبھی کوئی تین چار سانسوں کا وقفہ بیچ میں آتا، تو پھر ایک نہ رکنے والی کھانسی شروع ہو جاتی، کھانستے کھانستے اُس کا بُرا حال ہو جاتا، اور اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا، ہائے اللہ جی ہائے اللہ جی، میں مر گیا، میں جو کہ اُس کے ساتھ والے کمرے میں سویا ہوا تھا، رات کو جب بھی میری آنکھ کھلی، میں نے اُسے کھانستے ہوئے سُنا، پھر ایک آدھ بار اُس کو واش روم جاتے ہوئے، اُس کے قدموں کی آہٹ سے پہچانا، میرے دل میں اُس کے لئے بڑی ہمدردی تھی، رحم تھا، پر نہ جانے کیوں میں رات اُس کے ساتھ اُٹھ کر جاگنا نہیں چاہتا تھا، دل ہی دل میں، میں اُس کے لئے دُعا مانگ رہا تھا، اللہ پاک احسن کو صحت دے دے، یہ کیسی بیماری اِسے لاحق ہو گئی ہے، پورے پانچ دن ہو گئے تھے، کہ وہ بستر سے نہیں اُٹھ پایا تھا، اپنے محلے کے ڈاکٹر سے دو تین دفعہ چیک بھی کروا چکا تھا، اور ڈاکٹر نے دوائیاں بھی تبدیل کیں تھیں، مگر اُسے کوئی پل چین نہیں تھا، آرام نہیں تھا مگر جب صبح آتی تو وہ خراٹے بھر رہا ہوتا، اور پُر سکون نیند سو رہا ہوتا، تو میں شکر کرتا کہ چلو، تھوڑا آرام مل گیا، اور میں آرام سے اُٹھ کر اپنا ناشتہ خود بناتا، اور تیار ہو کر دفتر کے لئے نکل پڑتا، دفتر میں جا کر اپنی روٹین کا کام شروع کرتا، دوستوں یاروں اور کولیگ کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتا، اور شام پانچ بجے، جب میں میٹرو میں بیٹھ کر اپنے سٹاپ پر اُترتا، تو مجھے سٹاپ سے گھر پہنچنے تک پندرہ منٹ لگ جاتے، تقریباً اُس وقت مغرب کا وقت ہو چکا ہوتا، اور جب میں اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہوتا، تو مجھے احسن کی کھانسی کی آواز آنا شروع ہو جاتی، مجھے فلیٹ میں داخل ہوتا دیکھ کر احسن کہتا، تو دفتر سے آ گیا، تو میں کہتا احسن سُنا کیا حال ہے؟ دوائی لی تھی؟ کچھ کھانا کھایا ہے؟ کہ کچھ نہیں لیا؟ تو وہ بڑی بے چارگی کے ساتھ کمرے کی چھت کی

امین کنجاہی

طرف گھورنا شروع کر دیتا، اور نا جانے کن خیالوں میں کھو جاتا، میں اُسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھتا، پھر بھی میں اُس کے پاس آ کر بیٹھ جاتا، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر، پوچھتا احسن یار بتا تو سہی، تجھے کیا روگ ہے، کیا غم ہے، وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے اپنے بستر کے سرہانے کے نیچے سے، سگریٹ کی ڈبی نکالتا، سگریٹ سلگاتا، اور ایک لمبا کش لگانے کی کوشش کرتا، مگر اُس کی کھانسی آڑے آ جاتی، اور وہ لگاتار کھانسنے لگ جاتا، اور میں اُسے قریب پڑے ہوئے جگ میں سے پانی ڈال کر دیتا، اور وہ چند گھونٹ پانی پی کر تھوڑی دیر کے لئے پُر سکون ہو جاتا، میں نے احسن سے کہا یار تو گاؤں چلا جا، تیری بیماری بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور تیرا علاج بھی کوئی ٹھیک طریقے سے یہاں نہیں ہو رہا، کم از کم گاؤں میں تو اپنوں کے پاس تو رہے گا، وہ ایک بے معنی ہنسی ہنستا اور اُس کے چہرے پر ایک یاسیت پھیل جاتی، رنگت اُس کی پیلی پڑ چکی تھی، اور کلائیاں اُس کی بہت کمزور ہو چکی تھیں، میں نے اُسے پوچھا کل صبح کا ٹکٹ کروا دوں، ٹرین کا جو تیرے گاؤں سے گزرتی ہے، تو احسن تھوڑا پریشان سا ہو کر بولا کیا تو مجھ سے تنگ آ گیا ہے؟ یار تو تو ایسے نہیں تھا، ہم نے بچپن ساتھ گزارا ہے، کچے اکٹھے کھیلے ہیں، گلی ڈنڈا کھیلا ہے، بندر کلا ساتھ میں کھیلا ہے، یار ایک ہی سکول میں گاؤں میں اکٹھے پڑھے ہیں، اور تجھے یاد نہیں ہے، وہ جو ہمسایوں کی بیٹی تھی، بہت خوبصورت نازک سی جب ہم سکول جایا کرتے تھے، سائیکل پر تو وہ تانگے میں بیٹھ کر کالج جایا کرتی تھی، اور تجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے، کہ ہم دونوں کو وہ بہت پیاری لگتی تھی، مگر میں نے یاری میں آ کر اُس پر سے اپنا حق ختم کر لیا تھا، اور میں نے کہا تھا کہ، آج سے یہ تیری ہوئی، اور وہ ہنسنے لگا، اور کمال دیکھ کہ وہ ہم دونوں کی ہی نہ ہو پائی، ہم ٹھرے غریب لوگوں کے بچے، وہ چوہدرین تھی، اُس نے تو کسی بڑے جاگیر دار کے گھر بیاہے جانا تھا، مگر آج تک مجھے اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں یاد ہیں، جو کہ دیکھنے پر ہر وقت مسکراتی رہتی تھی، اور ہم دونوں کو شک پڑتا تھا کہ، وہ ہم سے پیار کرتی ہے، جو کہ سب کہتے ہیں جو ہنسی وہ پھنسی، مگر پھر تو کالج پڑھنے شہر چلا گیا، اور میں وہی گاؤں میں رہ گیا، تیرا باپ تو چھوٹا موٹا کسان تھا، اور اُن کے پاس اتنی مالی سکت تھی، کہ وہ تمہیں میٹرک کے بعد کالج کی پڑھائی کے لئے شہر بھیج سکتے تھے، مگر میرا باپ جس کی جوتوں کی دُکان تھی، اور وہ بھی ایک چھوٹے سے گاؤں میں اُس

کے پاس تے جوتے بنانے کے آرڈر تو بہت کم آتے تھے ، ہاں مگر مرمت والی جوتیاں بہت زیادہ آجایا کرتی تھیں، جن کو مرمت کر کے ہمارا باپ ہم دو بہن بھائی اور ماں کا پیٹ پالتا تھا، پھر اچانک ایک دن میرا باپ شدید گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے وقت اپنی دوکان پر کام کرتے ہوئے، دل کا شدید دورہ پڑنے سے فوت ہو گیا، اُس کے جانے کے بعد میں گھر میں سب سے بڑا تھا ، میں نے باپ کی دُوکان سنبھال لی ، مگر میرے پاس لوگ کام لے کر نہیں آتے تھے ، جو میرے باپ کے پرانے گاہک تھے ، اُنھوں نے آہستہ آہستہ آنا کم کر دیا ، ہمارے گھر کا خرچہ چلانا دُشوار ہو گیا، اور میں نے دُوکان چھوڑ کر مزدوری کرنی شروع کر دی ، ایک دن مزدوری کرتے ہوئے ، میرا پاؤں پھسلا اور میرے سر پر شدید چائیں آئیں، مجھے اُٹھا کر گاؤں کی سرکاری ڈسپنسری لے جایا گیا ، اور وہاں پر موجود ڈسپنسر نے مجھے دو ٹیکے لگائے ، سر پر گہری چوٹ آئی تھی ، وہاں پر ٹانکے لگا دیئے ، اور پٹی کر کے مجھے گھر بھیج دیا گیا، جب میں گھر پہنچا، تو میری ماں اور بہن پریشان ہو گئیں ، کہ احسن یہ کیا ہوا؟ میں نے کہا کچھ نہیں بس تھوڑی سی چوٹ لگی ہے، اور پھر کچھ دن کے لئے میں مزدوری کرنے سے بھی معذور ہو گیا ، اِس دوران میں میری ماں نے چوہدری کے گھر نوکری کر لی، اور وہ روز صبح چوہدری کے گھر چلی جاتی، اور اُن کا سارا کام کاج ہانڈی پکانا، کپڑے دھونا، صفائیاں کرنا، اور بازار کے سارے کام اپنے ذمہ لے لئے ، اور اِس کے جواب میں میری ماں وہاں روز شام کو ہمارے لئے بچا کُچا کھانا لے آتی، اور چوہدری کی بیوی میری ماں کو اپنے اور اپنے بچوں کے پُرانے کپڑے دے دیا کرتی ، جو ہم لوگ پہن کر گزارا کرتے تھے ، گرمیوں میں گرمیوں کے کپڑے، اور سردیوں میں گرم کپڑے اور میری ماں گاؤں کے بازار میں جب سردیوں میں انڈے کا مال آتا تو ہمارے لئے وہاں سے جوتے اور گرم سوئٹر وغیرہ بھی خرید لاتی، اور بڑی خوش ہوتی، کہ دیکھ احسن کتنا سوہنا ہے، ایسے لگتا ہے کہ اِس سوئٹر کو کسی انگریز نے ہاتھ ہی نہیں لگایا، بلکل نیا ہے، اور یہ رنگ تجھے بہت جچے گا، ایک دن میری ماں کو بخار تھا، اُس دن وہ چوہدری کے گھر کام پر نہ جا سکی، اور اُس نے میری بڑی بہن کو چوہدری کے گھر بھیج دیا، میری بہن جانا نہیں چاہتی تھی، اُسے شرم آتی تھی، یا پتا نہیں کیا بات تھی ، کہ وہ ماں سے ضد کر رہی تھی ، کہ اماں میں نہیں جانا، مگر میری ماں نے اُسے سمجھایا، کہ پُتر بھائی بیمار پڑا

ہے، مجھے سخت بخار ہے بس ایک دن کے
لئے چلی جا کل پھر سے میں چلی جایا کروں
گی، پھر میری بہن چوہدری کی حویلی چلی
گئی، اور شام کو بہت خوشی خوشی ہشاش
بشاش واپس لوٹی، اس کے ہاتھوں میں تازہ
کھانا تھا، اور گرم گرم روٹیاں، میری ماں
چونکی اور اس نے کہا پتر کیا تو چوہدری
صاحب کے گھر سے ان کے کھانے کا سارا
سامان اٹھا لائی ہے، تو پینو نے کہا نہیں اماں
یہ تو مجھے چوہدری صاحب نے خود کہا تھا، کہ
یہ کھانا اپنی ماں کے لئے اور اپنے بھائی کے
لئے لے جا، اماں وہ لوگ تو بڑے اچھے ہیں
، اتنی بڑی حویلی ہے، اتنے بڑے برآمدے
ہیں، اتنے کمرے ہیں، اماں تو تھکتی نہیں،
اتنا کام کر کے، ماں نے پوچھا، تو آج تھکی
ہے، اس نے کہا نہیں اماں میں تو نہیں تھکی،
اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سی جوانی
مجھے نظر آ رہی تھی، جو مجھے خوف دلا رہی تھی،
میں اندر سے کانپ گیا، مگر میں کچھ بول نہ
سکا، پھر کیا تھا، پینو روز حویلی جانا شروع
ہو گئی، خوشی خوشی اور یہ بات مجھے اور زیادہ
حیران کرتی تھی، کہ پہلی دفعہ تو پینو حویلی
جاتے ہوئے، رو رہی تھی، ڈر رہی تھی، مگر
اب اچانک یہ کیسی تبدیلی میرے دل میں
بُرے بُرے خیال آتے کہ کہیں چوہدری کا
بیٹا تو کہیں پینو کو پسند نہیں آ گیا، اور پینو نے
اُسے دل نہ دے دیا ہو، مگر پھر میں اپنے
آپ پر شرمندہ ہوتا، اور خود کو گالیاں دیتا،
کہ تو اپنی بہن کے بارے میں کیسی باتیں
سوچتا ہے، کچھ شرم کر، کچھ حیاء کر، مگر میرے
دل کا چور مجھے ہر روز ڈراتا، دن گزرتے
رہے، دن ہفتوں میں بدلتے مہینوں میں
تبدیل ہو گئے، اور ایک دن پینو اچانک گھر
میں چکرا کر گر پڑی، ماں نے فوری طور پر
اپنی ہمسائی کو بلایا، اور اُسے کہا، سکینہ دیکھ یہ
پینو کو کیا ہو گیا ہے، غسل خانے تک گئی تھی،
واپس آئی ہے، اور دھڑام سے گر گئی ہے،
ماسی سکینہ نے کہا، زینب فکر نہ کرو، ویسی ہی
آجکل موسم تبدیل ہو رہا ہے، اور اس موسم
میں اکثر گرمی کی وجہ سے چکر آ جاتا ہے، اور
کچھ حویلی میں الٹا سیدھا کھا لیا، ہو گا، جس
کی وجہ سے اس کو الٹیاں لگ گئیں ہیں، ایسا
کر اسے کالی پتی کا کاوا بنا کر دے، اللہ خیر
کرے گا، شام تک ٹھیک ہو جائے گی، ہمارا
گھر صرف دو کمروں کا گھر تھا، وہ بھی
چھوٹے چھوٹے، درمیان میں چھوٹا سا صحن
تھا، صحن کے دائیں جانب باورچی خانہ تھا،
اور بائیں جانب غسل خانہ، ہمارے گھر کا
صحن اینٹوں کا بنا ہوا تھا، اتنے میں، میں گھر
آ گیا، ماں نے کہا نہیں پتر آج تو وہ گئی ہی
نہیں، میں نے کہا کیوں خیر ہو، ماں نے بتا
یا کہ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے،

اُسے چکر آرہے ہیں، اٹھ کر جب بھی بیٹھتی ہے، تو اُلٹی کر دیتی ہے، محلے کے ڈسپنسر سے میں دوائی بھی لے کر آئی ہوں، وہ کہتا ہے، کوئی نہیں ایک دو خوراک لے گی ٹھیک ہو جائے گی، اُس نے ہاضمے کا لال رنگ کا مکسچر بھی دیا ہے، اور وہ کہتا ہے، کہ کل تک پینو بلکل ٹھیک ہو جائے گی، میں خاموشی سے جا کر پینو کی چارپائی پر بیٹھ گیا، پینو نے جب سے حویلی جانا شروع کیا تھا، اُس کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی تھی، اور وہ جو فاقہ زدہ زندگی ہمارے ساتھ گزار رہی تھی، حویلی میں کام کرنے سے اُس کی رنگت میں فرق پڑ گیا تھا، اُس کا وجود بھی بھاری ہو گیا تھا، میں نے پینو کے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا، اور کہا پتر کیا حال ہے، طبیعت زیادہ تو نہیں خراب، اُس نے کہا نہیں بھا جی میں ٹھیک ہوں اماں ایسی ہی فکر کرتی رہتی ہے، میں صبح بھلی چنگی ہو جاؤں گی، اور آپ سوئے ہوں گے تو میں حویلی کام کے لئے چلی جاؤں گی دیکھنا، اتنے میں اماں آ گئیں، اماں نے کہا، چل شودی آرام سے اب سو، سارا دن کا میرا جینا حرام کیا ہوا ہے، اب بھائی آیا ہے، تو بھائی کے ساتھ لاڈے مائیاں کر رہی ہے، میں خاموشی سے اُٹھا، اور اپنے دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا، مگر پھر آدھی رات کے وقت میری

اچانک آنکھ کھلی میرے اندر کا چور مجھے کہہ رہا تھا، کہ چوری ہو گئی ہے، مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی، جب صبح میں اُٹھا، تو ماں نے مجھے چائے بنا کر دی، میں نے پوچھا کہ پینو حویلی چلی گئی ہے، ماں نے کہا ہاں پتر مجھے ٹھیک لگتی تو نہیں تھی، مگر وہ بضد تھی، کہ میں نے کام پر جانا ہے، احسن اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا، اور میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا، کہ صبح میں احسن کو ہر حال میں اس کے گاؤں میں واپس بھیج دوں گا، مگر احسن کی آواز نے مجھے پھر چونکا دیا، جاوید اُس دن جب میں شام کو مزدوری کر کے گھر واپس آرہا تھا، تو بہت زیادہ بھیڑ میں نے اپنی گلی میں دیکھی ایسے لگتا تھا کہ سارا گاؤں میرے گھر کے باہر کھڑا ہے، میں نے ایک بچے سے پوچھا، کہ بیٹا یہ رش کیوں لگا ہوا ہے، اُس بچے نے کہا، کہ چاچی جینا کی بیٹی، بچے کی ماں بننے والی ہے، جاوید وہ دن اور آج کا دن میں اپنے گھر اور اپنے گاؤں سے نکل آیا، اور میرا ڈر سچ ثابت ہوا، کیونکہ چوری ہو چکی تھی، یہ کہتے ہوئے، احسن پھر کھانسے لگا کھانستے کھانستے اُس کا سانس اُکھڑ گیا، میں اُسے فوری طور پر شہر کے سرکاری ہسپتال کی ایمرجنسی میں لے گیا، دس روپے کی پرچی بنائی، اور احسن کو ایمرجنسی وارڈ میں ایک بستر پر لیٹا دیا گیا، ڈیوٹی

ڈاکٹر آیا، اُس نے احسن کا طبی معائنہ کیا، کچھ دوائیاں لکھیں، کچھ ٹیسٹ لکھے، اور ایکسرے کا کہا، کہ ایکسرے کروالیں، اور جاتے ہوئے یہ کہہ گیا، کہ ٹیسٹ اور ایکسرے، تو ہسپتال سے ہو جائیں گا، ہاں یہ ٹیکے اور دوائیاں آپ باہر سے لے آئیں، میں نے جلدی سے وہ دوائیوں والی پرچی پکڑی، اور باہر ہسپتال سے باہر نکل گیا، جب میں واپس آیا، تو وارڈ بوائے احسن کا ایکسرے کروانے لے کر گئے ہوئے تھے، چونکہ ڈاکٹر نے اُس کی چھاتی کا ایکسرے کروانے کا کہا تھا، اور باقی خون کے ٹیسٹ تھے، جن کی رپورٹ صبح ملنی تھی، اتنے میں احسن کو وارڈ بوائے وہیل چیئر پر لے کر واپس ایمرجنسی بیڈ پر لیٹا گیا، اور میں نے اُس سے پوچھا کہ بھائی ایکسرے کی رپورٹ کب ملے گی، اُس نے کہا کہ گھنٹہ لگ جائے گا، اور احسن پھر کھانسنے لگا، اور اُس کا سانس، پھر اُکھڑ گیا، میں نے بھاگ کر ڈیوٹی پر موجود سٹاف سے کہا، کہ پلیز آ کر ذرا 12 نمبر بیڈ والے مریض کو دیکھ لیں، سٹاف بڑے اطمینان سے بولی آپ جائیے، میں آتی ہوں، اُس کے آنے تک احسن کا سانس اور زیادہ پھول چکا تھا، اُس نے آتے ہی وارڈ بوائے سے کہا کہ، کہ بیڈ نمبر 12 کے مریض کو آکسیجن لگا دو، اور وارڈ بوائے نے فوری طور پر آکسیجن کا سلینڈر آن کر کے چیک کیا اور آکسیجن والا ماسک احسن کے ناک پر رکھ دیا، کچھ دیر بعد احسن کی طبیعت تھوڑا بحال ہوئی، میں نے اُسے کہا کہ اب تو بھلا چنگا ہو کر اپنے گھر اور گاؤں واپس جائے گا بس، اگر تو میرا یار ہے تو، اُس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آ گئی، پھر احسن کو ایمرجنسی وارڈ سے جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا، رات کافی ہو چکی تھی، مجھے احسن نے اشارے سے کہا، کہ تم اب گھر جاؤ، مگر میں جانے کے لئے تیار نہیں تھا، پھر بھی مجھے جنرل وارڈ میں موجود سٹاف نے کہا، کہ آپ گھر جائیں کوئی بات نہیں مریض کی حالت اب بہتر ہے، اور خطرے سے باہر ہے، تو میں نے پھر احسن کا ہاتھ پکڑا، اور اُسے دبایا، اور آنکھوں آنکھوں میں اُسے کہا کہ اللہ خیر کرے گا، مگر میرے اندر کا چور کہہ رہا تھا، کہ چوری ہو گئی ہے، میں تھکے ہارے جسم کے ساتھ، واپس اپنے فلیٹ پر آ گیا، صبح میں اُٹھا، اور دفتر جانے کے بجائے، میں سرکاری ہسپتال کی طرف چل پڑا، ابھی میں جنرل وارڈ میں پہنچا تھا، کہ سٹریچر پر کسی مریض کو چادر میں لپیٹے ہوئے وارڈ بوائے لے کر جا رہے تھے، میں جب احسن کے بیڈ کے قریب پہنچا تو بیڈ خالی تھا۔

☆☆☆☆☆

''بس؟''

رومانہ رومی

آج خلاف معمول آفس میں، میں کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گیا۔ جب کہ صبح میری بیوی برکھا نے مجھے خاص طور پر یاد دہانی بھی کروائی تھی کہ آج ہماری اکلوتی لاڈلی بیٹی کومل کی سالگرہ ہے اور اُس نے شام کو چند خاص مہمانوں کو گھر پر کھانے کے لیے بلایا ہے۔ یہ خاص مہمان اگرچہ اُس کے اپنے ہی گھر والے تھے اس کے باوجود برکھا کی ناراضگی کا خوف محسوس کرتے ہوئے میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ برکھا نے خلاف توقع ابھی تک مجھے فون نہیں کیا تھا اور میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کی اِس چپ کا مطلب ایک بڑے طوفان کی آمد کا سبب بن سکتا تھا۔ شاید آپ لوگوں کے ساتھ بھی اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہوگا کہ جب آپ کو کہیں پہنچنے کی جلدی ہو تو تمام سڑکیں بلاک ملتی ہیں۔ اور آپ ہر سگنل پر ٹھیک اُس وقت پہنچتے ہیں جب بتی کا رنگ آپ کو دیکھتے ہی سرخ ہو جائے یعنی پوری دنیا ایک ساتھ آپ کی بے بسی پر ایک ہی وقت میں مسکرانے لگتی ہے۔ آج میرے ساتھ بھی صبح سے ایسا ہی معاملہ چل رہا تھا۔ پورے دن جلد از جلد کام نمٹانے کے باوجود ایک ایسا کام عین چھٹی کے وقت آ پھنسا کہ انکار کرتا

تو نوکری سے ہاتھ دھونے کا خطرہ بڑھ جاتا اور جو کر کے نکلا تو اب بیوی کے غصہ کے خوف سے جان ہلکان ہوتی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کے میں سب سے لمبے ٹائم والا سگنل کراس کرتا آگے والی کی گاڑی کے اچانک بند ہونے سے جیسے کسی نے میرا دل حلق میں لا چھوڑا۔ میں بڑبڑایا "اُف! اب کرو چند منٹ کا اور انتظار ساون جی..... آج تو تم گئے اپنی جان سے؟" اتنے میں گاڑی کے بند شیشے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔ گرمی بھی آج قیامت کی تھی اور گاڑی میں AC چلنے کے باوجود جسم ابھی بھی پسینے میں تر تھا۔ میں نے باہر دیکھا ایک نازک سی صاف ستھری چھوٹی سی پیاری بچی اپنے ہاتھوں میں خوبصورت گلاب کے پھول لیے میری طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی معصوم آنکھیں دن بھر کی گرمی اور گرد و غبار کے باوجود زندگی سے بھرپور تھیں۔ چہرے پر غمِ روزگار کی پرچھائیاں تحریر تھیں مگر اُمید کا دامن تھامے وہ اپنے ہاتوں میں پھول اُٹھائے دنیا میں خوشبو کی حکمرانی چاہتی تھی۔ نہ جانے وہ کب سے اس گرمی میں کھڑی اس سڑک پر پھول بیچ رہی تھی کہ اُس کے ہاتھوں کا سفید رنگ سلونا ہو چکا تھا۔ جسم پر ہلکا سا لان کا صاف سا سادہ سوٹ تھا۔ سر پر ڈوپٹا اچھی طرح بندھا ہوا۔ مجھے نہ جانے کیوں اُس میں اپنی کومل کا عکس دکھائی دینے لگا۔ عمر بھی اتنی ہی تھی اُس کی۔ مگر یہ تقدیر کون لکھتا ہے بھلا؟۔ شیشے کے نیچے ہوتے ہی اُس نے نہایت دھیمے سے لہجے میں کہا "صاحب جی بس 20 روپے کا ہے ایک پھول۔ آپ کو کتنے دوں؟"۔ اُس کی آواز میں بلا کی معصومیت اور التجا تھی۔ میری گاڑی کا شیشے نیچے ہونے سے شاید اُس کے ننھے سے دل میں اُمید نے سر اُٹھا لیا تھا وہ اس گرمی میں بری طرح تھک چکی تھی اس لیے جلد از جلد اُن پھولوں کو بیچ کر گھر جانا چاہتی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ گلاب کے اتنے خوبصورت پھول بہترین انداز میں پیک ہونے کے باوجود صرف 20 روپے میں کیوں بیچ رہی ہے جب کے یہی پھول 50 روپے سے کم میں ملنا ناممکن ہے۔ میں نے تجسس کے مارے پوچھا کہ وہ اتنے مہنگے پھول کیوں کم داموں میں بیچ رہی ہے تو وہ بولی "یہ پھول میری ماں گھر میں اُگاتی ہیں اور بازار سے یہ کاغذ بھی سستے میں لے کر خود پیک کرتی ہے جس پر ہمارے دس روپے زیادہ خرچہ نہیں ہوتا اور ہر پھول پر پھر بھی دس روپے بچ جاتے ہیں۔ قیمت کم ہونے کی وجہ سے پھول جلد بک جاتے ہیں اور میں دن کی روشنی میں ہی گھر واپس ہو لیتی ہوں مگر آج گرمی کی وجہ سے لوگوں نے اپنی AC گاڑی کا شیشہ ہی نہیں اتارا کہ میری

بات سن لیتے اور میرے پھول بک جاتے"..... اُس نے ایک ہی سانس میں اپنی پوری کہانی میرے گوش گزار کر دی۔ اس کی معصومیت بھری بات سُن کر میرا دل اُس کے درد میں ڈوب سا گیا۔ میں نے یوں ہی دوسرا سوال کر دیا۔ "تمھارے گھر میں اور کوئی نہیں جو تم یہاں اکیلی آئی ہو؟ ڈر نہیں لگتا تمھیں؟ ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے جو تمھاری ماں نے تمھیں یوں اکیلے چھوڑ رکھا ہے؟"..... اُس کی آنکھوں میں اچانک کسی محرومی نے جگہ لے لی گو کہ آنکھیں نم نہیں تھی مگر اُس نے ننھے سے دل پر گرنے والے آنسوؤں کی آواز اُس کی سانسوں سے سفر کرتی میرے کانوں میں سنجر اتا رہی تھی۔ وہ سنبھلی "نہیں صاحب! گھر میں صرف میری ماں، میرے معذور دادا اور میں ہوں..... باقی سب زلزلے میں"۔ اور اپنا سر نیچے کر لیا۔ اُف یعنی یہ معصوم اپنے گھر کی واحد کفیل تھی۔ میں نے پوچھا "تو کیا آپ لوگوں کا گزارا ہو جاتا ہے یہ چند کلیاں بیچ کر؟"..... "نہیں صاحب جی! میری ماں گھر میں سلائی کا کام بھی کرتی ہے اور جب پودوں میں پھول آجاتے ہیں تو میں اُن کو آکر بیچ دیتی ہوں، جس سے کچھ اور آمدنی ہو جاتی ہے..... اچھا آپ جلدی کریں نا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے ابھی پھول بھی باقی ہیں اور اندھیرا گہرا ہو رہا ہے"۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں پکڑے پھولوں کو دیکھا جو بس اب چھ ہی بچے تھے میں نے اُس سے سارے کے سارے پھول لینے کا فیصلہ کر لیا اور اُس کے ہاتھوں میں پانچ سو کا نوٹ دے کر کہا کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر چلی جائے۔ اُس نے کہا کہ اِس نوٹ کا کھلا نہیں اُس کے پاس۔ میں نے کہا کہ تم یہ سارے پیسے رکھ سکتی ہوں اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور گاڑی کا شیشہ اوپر کر لیا مگر جیسے ہی میں نے شیشہ اوپر کر کے باہر جھانکا تو وہ ابھی تک میرے سامنے کھڑی مجھے عجیب نظروں سے گھور رہی تھی اُس کی نظروں میں سوال تھا جس کو سمجھنے سے میں قاصر تھا۔ میں نے پھر سے کھڑکی کا شیشہ نیچے کی اور اُس سے کہا "کیا ہوا بیٹا! کوئی بات کہنی ہے اپ کو مجھ سے؟" اور سامنے سگنل کی جانب دیکھا جہاں اب صرف 30 سیکنڈ کا وقت بچا تھا۔ میری نظریں اُس کی نظروں سے ملی تو وہ بولی "میرے چھ پھولوں کے 120 روپے بنتے تھے آپ نے پانچ سو روپے دیے اور"..... "اور کیا جلدی بولو بچی؟"..... وہ ہچکچائی "اور صرف سر پر ہی ہاتھ پھیرا ہے؟"..... سگنل ہرا ہو چکا تھا.....

☆☆☆☆☆

گھر آجا پردیسی

فیصل یورپ کے ایک ترقی یافتہ ملک کے ایک بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور میں کھڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں برقی زینے مخصوص رفتار سے تیر رہے تھے۔ ان پر موجود بے حس و حرکت لوگ بلندی اور پستی کی جانب محوِ سفر تھے۔ ایک طرف ایک بڑی سی شوشاپ تھی جس کے داخلی دروازے کے عین اوپر باریک برقی قندیلیں جل بجھ کر اس دکان کا نام بتا رہی تھیں۔ دوسری طرف ملبوسات کا عظیم الشان سٹور تھا۔

لوگ مخصوص یورپی طرز کے پیراہن اپنے بدن پر سجائے گھوم رہے تھے۔ پتلون، شرٹ، کوٹ، جینکٹ، سکرٹ، ٹی شرٹس اور شارٹس میں ملبوس، مرد، عورتیں اور بچے یہاں وہاں پھیلے ہوئے تھے۔

وہ ایک سال پہلے ہی یہاں آیا تھا۔ روزگار مل گیا۔ آمدنی کا ایک معقول حصہ اپنے وطن میں موجود ماں، دو بھائیوں اور دو بہنوں کی ضروریات کے لیے ویسٹرن یونین کی بھٹی میں جھونک دینے کے بعد بھی مناسب یورو اس کے پاس بچ جاتے جو اس اکیلے کی ضروریات کے لیے کافی تھے۔

وہ برقی زینے پر سوار ہوا تو پرسکون سمندر میں تیراکی کرنے والی کسی لانچ کی طرف بہتا ہوا اوپری منزل پر جا پہنچا۔ "ڈاکٹر ڈیم روبوٹ بینک" نامی دکان کے ایلومینیم اور شیشے سے بنے دروازے پر کھڑے ایک لمبے قد والے روبوٹ نے اس کے سرکتے قدموں میں بیڑیاں سی ڈال دیں۔

"کوئی..... مسئلہ..... کوئی..... مشکل..... ڈاکٹر ڈیم کے روبوٹس کے سامنے۔ اڑ نہ جائے، تو کہنا" کے الفاظ کو دہراتا ہوا، اپنی بائیں ہاتھ کو آہنی پیٹ پر رکھ کر تھوڑا جھکتا ہوا، سینے میں لگی لائٹس کے رنگ بدلتا ہوا، خوبصورت گورا چٹا روبوٹ اسے دکان کے اندر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

امین جان

وہ اندر چلا گیا۔ فرش پر مختلف قد و قامت کے، بھانت بھانت کی شکلوں والے، قدیم و جدید، بجلی اور شمسی توانائی سے چلنے والے آہنی انسانوں کے الگ الگ ماڈل کھڑے تھے۔ وہ آگے بڑھا۔ کچھ روبوٹ ساکت و جامد کھڑے تھے جبکہ کچھ جل بجھ رہے تھے۔ آنکھوں کی جگہ موجود رنگ رنگ کے بلب آن آف ہو رہے تھے۔ کچھ کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ایک انسانی مشین کے پاس رکا اس نے اپنا آہنی سر گول گول گھمایا، فیصل کی طرف فوکس کیا، روشنیاں جلی بجھیں، زوں زوں کی آوازیں نکلیں۔

"ٹونی..... تھری..... فور..... ٹو۔ کم قیمت اعلیٰ کام۔ آج ہی گھر لے چلئے۔ آج ہی دوستی شروع" وہ رک رک کر مشینی انداز میں بولنے لگا۔

فیصل آگے بڑھ گیا۔ ایک خانے میں موجود ایک بڑا سا باکس اس کی نظر میں آیا۔ جس پر ایک فی میل روبوٹ کی ایسی خوبصورت تصویر تھی جیسے کوئی حسینہ۔ "ڈاکٹر ڈیم کی ٹوبٹی" کے الفاظ باکس پر جگمگا رہے تھے۔ اس نے چند لمحے سوچا، باکس اٹھایا اور کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔ کاؤنٹر پر موجود ایک چھوٹے قد کے روبوٹ کے منہ میں اپنا کریڈٹ کارڈ ڈال کر، مطلوبہ رقم منہا کروائی اور برقی زینے پر بہتا ہوا نیچے آیا۔ باہر موجود اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

اپنے فلیٹ میں آ کر اس نے ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ خوبصورت ٹوبٹی کی تصویر اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ بالکل کسی انسان کی طرح ڈیزائن کی گئی تھی۔ ہلکی نیلی آنکھیں، گوری رنگت، پھولے گال، سنہری بال، مناسب قد۔

ڈبے پر "ہیومین ٹوائے گرل" اور "ٹو تھاؤزینڈ جی بی" کے الفاظ جلی حروف میں موجود تھے۔ ڈبہ کھلا، ٹوبٹی آٹھ دس حصوں میں تھی۔ چپچپاتے کل پرزے، پلاسٹک، شیشے، ایلومینیم، فائبر اور لوہے سے بنے ہوئے تھے۔ شفاف تھیلوں میں لپٹے پارٹس نکالتے ہوئے اس نے چھوٹی سی سفید کتاب بھی نکالی، جس پر ٹوبٹی کو جوڑنے، چارج کرنے اور چلانے کی ہدایات موجود تھیں۔ وہ ان ہدایات کے مطابق پارٹس کو جوڑتا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک خوبصورت نوجوان لڑکی بے جان گڑیا کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔ فیصل نے اسے چارجنگ پر لگایا اور خود بستر پر دراز ہو کر نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

خوابوں میں وہ اپنے شہر جا پہنچا جہاں اس کی منگیتر رابعہ رہتی تھی۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بار بار اس کی گلی میں گزرا کرتا۔ یورپ آنے سے پہلے وہ اس کے گھر آئی۔ نم پلکوں سے اسے کہہ رہی تھی کہ "انگریزی میموں سے بچ کر رہنا۔ یہ وہاں جانے والوں کو واپس نہیں آنے دیتیں، اور سنو جلدی گھر واپس آ جانا۔" وہ بھی رابعہ کی

باتوں سے اداس ہوا لیکن بہت سا روپیہ کمانے کے لیے اپنے پیاروں، سنگی ساتھیوں سے بچھڑنا ضروری تھا۔ دوستوں، محلے داروں، بہن بھائیوں کے تار پو سے بُنے خواب ختم ہوئے تو وہ صبح جاگا۔ ٹوئیٹی وہیں کھڑی تھی، جہاں رات کو اس نے چھوڑا تھا۔

اس نے ٹوئیٹی کی کمر پر موجود سٹارٹ کے بٹن کو پریس کیا۔ روشنیاں جلنے بجھنے، زوں زوں کی آوازیں آنے، سر کے گول گھوم کر رکنے اور دو چار قدم آگے پیچھے چل کر خود کو سیٹ کرنے میں ٹوئیٹی کو دو منٹ لگے۔ فیصل نے اس کی سیٹنگ میں جا کر اسے "گھریلو لڑکی" کے موڈ پر ایڈجسٹ کر لیا۔

"جی..... فرمائیے..... ٹوئیٹی..... آپ کی کیا..... خدمت..... کرے" رک رک کر مخصوص مشینی لہجے میں خوبصورت نسوانی آواز اس کے کمرے میں گونجی۔ وہ ایک لمحے کو حیران ہوا لیکن جلد ہی سائنس کی ترقی کو قبول کرتے ہوئے بولا۔

"اپنے بارے میں بتاؤ" فیصل بولا۔

"میں ..... ٹوئیٹی..... ٹو فائیو..... ہیومن ٹوائے گرل..... ٹوتھاؤزینڈ جی بی..... ورژن فور"

"کیا کیا کر سکتی ہو" فیصل نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جو..... آپ..... کہیں" وہ ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔

"کھانا بنانا، برتن دھونا.....؟ فیصل نے پوچھا۔

"جی بالکل..... جو کام کروانا ہو۔ میرے سامنے..... ایک مرتبہ..... کر کے..... فیڈ کا بٹن..... دبا دیں۔ میں کر لوں گی۔" وہ رک کر بولتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

فیصل کو اپنی ماں کی بات یاد آ گئی جو اکثر فون پر اسے کہتی۔

"فیصل پتر جلدی سے پاکستان واپس آ، تیرے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے، تیرا ویاہ کریں، تیرے لیے روٹی پکانے والی آ جائے، مجھے بھی تھوڑا سا ساہ ملے۔ اور دیکھ ان گوریوں کے چکر میں نہ پڑنا۔ جلدی واپس آنا ہم تیری راہ تک رہے ہیں" فیصل سوچ میں ڈوب گیا۔

"کس سوچ..... میں..... پڑ گئے..... ہیں" ٹوئیٹی بولی۔

وہ چونک سا گیا۔ روبوٹ سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی اسے۔

"نہیں..... کچھ نہیں"۔ وہ بوکھلا سا گیا پھر ہنسنے لگا۔

"آپ..... ہنستے..... ہوئے اچھے..... لگتے..... ہیں" ٹوئیٹی بولی۔ وہ ایک بار پھر چونک گیا۔ اسے ایک لمحے کے لیے ٹوئیٹی سے خوف سا محسوس ہوا۔ لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ٹوئیٹی کو آف کر کے وہ اپنے آفس چل دیا۔ سارا دن اس کے ذہن میں ٹوئیٹی اور اس کی باتیں گھومتی رہیں۔

شام کو واپسی پر اس نے جیسے ہی اس کو آن کیا، آواز آئی۔

"کیسے ہیں..... آپ..... آج کا..... دن..... کیسا رہا"

"بہت اچھا" فیصل خوشگوار لہجے میں بولا۔

"میرے..... لیے..... کیا..... احکامات..... ہیں" وہ بولتے ہوئے فیصل کے کچھ قریب آ گئی۔

فیصل نے اس کے سامنے کھانا بنایا، برتن دھوئے، کپڑے استری کیے، گھر کی صفائی کی اور فیڈ کا بٹن دبا دیا۔ یہ سب کچھ اس کی میموری میں فٹ ہو گیا۔ اگلی شام آنے تک اس نے فیصل کے آنے سے پہلے یہ سب کام کر دیئے۔

"آپ تھک گئے ہوں گے۔ آرام کر لیجیے" ٹوئیٹی اس کے لیے پانی کا گلاس لے کر بالکل انسانی انداز میں چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ فیصل اسے بغور دیکھنے لگا۔

"کیا خوبصورت ڈیوائس ہے" اس نے سوچا۔

اگلے چند دنوں میں وہ ٹوئیٹی کا عادی ہو چکا تھا۔ ایک شام وہ گھر آیا تو اس کی پیار بھری آواز سنائی دی۔

"آپ جلد..... گھر آیا کریں..... میرا آپ کے بغیر دل نہیں..... لگتا" ٹوئیٹی کے دل کے مقام پر رنگ برنگ بتیاں تیزی سے جلتی بجھتی اور رنگ بدلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ فیصل کے لیے چائے بھی بنانے لگی۔ سر بھی دباتی۔ ایک شام وہ گھر آیا تو وہ بولی،

"آپ کو..... سالگرہ..... بہت بہت..... مبارک ہو"۔ آج اس کی رفتار اور بولنے میں تیزی تھی۔

"یہ سب کیا ہے..... تم ایک انسان کی طرح کیسے سوچ لیتی ہو" فیصل نے سوال کر ہی دیا۔ ٹوئیٹی کے دل کا بلب جلنے بجھنے لگا۔ آنکھوں کی روشنی مدھم پڑ گئی، وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی۔

"انجیلا..... جس نے مجھے بنایا۔ وہ ڈاکٹر ڈیم کی فیکٹری میں روبو انجینئر تھی۔ میں اسکی آخری پراڈکٹ ہوں۔ وہ خود مرنے والی تھی۔ اس نے اپنے جذبات، احساسات، محبت، درد، سوچ اور یادداشت مجھ میں ٹرانسفر کر دیں۔ وہ مجھے بالکل ایک ہیومن جیسا بنا گئی۔ بالکل ایک انسان کی طرح۔ اور سنیں! میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ پلیز مجھے چھوڑیے، توڑیے یا بیچیے گا نہیں۔" وہ بول رہی تھی اور فیصل کے دماغ میں رابعہ، امی، بھائی اور بہنیں گھومنے لگیں۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ جائے اور اپنے دیس چلا جائے۔

"لیکن ایک مشین..... انسان سے....."

فیصل نے کہنا چاہا، لیکن ٹوئیٹی نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہنے لگی۔

"ایک روبوٹ کے بھی کچھ..... جذبات ہوتے ہیں..... وہ بھی کسی کو پسند کر سکتا ہے..... اور اگر آپ نے میری محبت کو قبول

نہ کیا تو میں ...... خود کو اوور چارج کر کے یا پھر اپنے پارٹس کو کھول کر ڈیمیج کر لوں گی۔"

فیصل کو اس کے ہاتھ میں گداز سا لمس محسوس ہوا۔ اس نے فوراً ٹویٹی کو آف کیا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خواب میں ٹویٹی کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن بے سود۔ صبح آفس میں بیٹھے بیٹھے اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس انسان نما مشین کو واپس کر دیا جائے۔

جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ ٹویٹی گھر کے سب کام ختم کر کے اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اس نے شاید اپنے آپ کو خود ہی آن کر لیا تھا۔ ٹویٹی آج کچھ زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ فیصل اسے آف کرنے کے لیے آگے بڑھا، لیکن وہ آگے بڑھی اور اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ فیصل نے دوبارہ کوشش کی تو ٹویٹی نے اسے اپنے آہنی ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ وہ بے بس ہو گیا۔ ٹویٹی نے اپنے دل کی سرخ سبز ہوتی ہوئی روشنی میں سے ایک لمبی سی چپ نکالی اور اسے فیصل کے دل کے پاس پسلیوں میں گھسانے کی کوشش کرنے لگی۔

فیصل نے مزاحمت کی لیکن ٹویٹی کے اندر نہ جانے کیسے اتنی طاقت آ گئی تھی۔ اس نے وہ چپ فیصل کی پسلیوں میں گھسا ڈالی۔ فیصل نے ایک چیخ ماری۔ رابعہ اور امی کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ عجیب سے جھماکے ہونے لگے۔ ذہن میں ٹوں ٹوں...... زوں زوں ہونے لگی۔ دل کی دھک دھک، گھر رگھر ر میں بدل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں کسی برقی طاقت سے روشن ہو گئی ہوں۔ اسے اپنا جسم آہنی سا محسوس ہونے لگا۔ سر کو گول گول گھما کر، ہاتھ پاؤں ہلا کر خود کو سیٹ کرنے میں اسے دو منٹ لگ گئے۔ اس کے بعد اسے نیند آ گئی۔ نہ معلوم کتنی دیر کے بعد اس کی آنکھیں کھلیں۔ ٹویٹی اس کے پاس بیٹھی اسے چارج کر رہی تھی۔ فیصل کے آنکھیں کھولتے ہی اس نے چارجر اتار دیا۔ فیصل کو اپنا سر بھاری بھاری محسوس ہوا۔

"مجھے...... کام...... پر...... جانا...... ہے"

فیصل نے بولنے کی کوشش کی تو آواز رک رک کر اور مشینی انداز میں نکلی۔

"کیوں" ٹویٹی تیزی سے بولی۔

"ارے ہاں...... مجھے یاد آیا...... میں تمہیں چھوڑ کر...... کہیں نہیں جاؤں گا"، فیصل نے سر کو گول گول گھمایا۔

"آج ہمیں ڈاکٹر ڈیم روبوٹ بینک جانا ہے۔ ٹویٹی نے اس کی کمر میں بازو ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیوں...... جانا ہے" مشینی اور بھاری آواز فیصل کی تھی۔

"مجھے تمہارے لیے کچھ نئے پارٹس خریدنے ہیں" ٹویٹی نے کہا۔ اس کے دل کے بلب تیزی سے جل بجھ رہے تھے۔ آنکھوں کے قمقمے خوب روشن اور چارجنگ فل تھی۔

☆☆☆☆☆

بدلتے رستے

جمیلہ وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے سرسبز و زرخیز کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی تنگ پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ گنگناتے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے گھنے اور سایہ دار کھلیان کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں سالن کی چھوٹی سٹیل کی دستی بالٹی اور ساتھ ہی روٹیوں کی پوٹلی جبکہ دوسرے ہاتھ میں لسی کا سلوری گلن تھامے۔ روٹیوں کی پوٹلی میں دو تندوری روٹیوں کے بیچ تلی ہوئی سرسوں کے ساگ کی پلیٹ اور ساتھ ہی کٹا ہوا پیاز رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی سالن ڈالنے کے لئے خالی پلیٹ بھی موجود تھا۔ بالٹی میں اپنے کھیت کی تازہ سبزیوں کا سالن تھا۔ وہ اپنے بابا کے لئے روٹی لے کر آئی تھی جو صبح سے کھیتوں کو پانی دے رہا تھا۔ کھلیان میں ایک بڑا کنواں کھودا گیا تھا جس سے ذرا فاصلے پر توت کے تین تناور سایہ دار درخت کھلیان پر گھرا سایہ کئے رہتے تھے۔ کنویں کے اوپر لکڑی کا راہٹ نصب تھا۔ دو بڑے بڑے گول پہیے جن میں سے ایک افقی اور دوسرا عمودی اس طرح نصب تھے کہ ایک پہیے کے گھومنے سے دوسرا بھی گھومنے لگتا کیوں کہ ایک کے دندانے دوسرے میں پیوست تھے۔ سرخ رنگ کا بڑا اور مضبوط بیل راہٹ کھینچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر بڑے رنگ دار رومال کی پٹی باندھ کر پیچھے ایک موٹی اور مضبوط لکڑی باندھی گئی تھی۔ اسی لکڑی کو کھینچنے سے راہٹ کے گول پہیے گھومتے، سلور کے بنے چھوٹے چھوٹے ڈول جنہیں مضبوط رسیوں کے ساتھ سلسلہ وار باندھا گیا تھا، نیچے کنویں میں جاتے اور بھر کر اوپر آتے۔ یہی پانی سے بھرے ڈول اوپر پہنچ کر کنویں کے اوپر نصب لوہے کی نالی میں الٹتے اور وہاں سے یہ پانی بہہ کر کچی پکی نالیوں کے ذریعے کھیتوں میں پہنچتا۔ خالی ڈول پھر کنویں کے اندر پہنچتے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا اور پانی بہتا رہتا۔ اسی پانی سے کھیت سیراب ہوتے، پودوں کی پیاس بجھتی اور انسان کے پیٹ بھرنے کا سامان ہوتا۔ علی یار آج صبح ہی سے اسی کام

نور کمال شاہ

میں مصروف تھا- اور اب تو دوپہر ہو چکی تھی- جمیلہ کو آتے دیکھ کر وہ مسکرایا- جمیلہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے کھانے کے برتن کھلیان میں رکھ کر بابا کے پاس کھیت کے درمیان میں پہنچی- علی یار ساٹھ پینسٹھ سال کے لگ بھگ عمر رسیدہ شخص تھا- درمیانی قد کاٹھ، سرخ سفید رنگت، جسے وقت اور حالات کے جبر نے دھندلایا تھا اور چہرے پر گھنی سفید داڑھی؛ جمیلہ اس کی نو دس سال کی نواسی تھی- آخری کھیت میں پانی چھوڑ کر علی یار جمیلہ ساتھ کھلیان پہنچا اور ہاتھ دھو کر کھانا کھانے لگا- بیل اسی طرح دائرے میں گھوم کر راہٹ گھماتا رہا- سب کچھ ٹھیک ہی تھا- سکون اور اطمینان کا ماحول تھا- مگر چند کوس کے فاصلے پر واقع گاؤں میں حالات نے دوسرا رخ اختیار کر لیا تھا- ساکن پانی میں ارتعاش پیدا ہو چکا تھا- مگر علی یار کو بگڑتے حالات کا کچھ علم نہیں تھا- اسے تو بابا قدیر کی موت کا علم بھی نواسی کے زبانی ہوا- علی یار کو تو اس وقت حالات کی نزاکت کا احساس ہوا جب وہ جلدی جلدی کھیت کا کام نمٹا کر جنازے میں شرکت کی غرض سے سہ پہر کو کھیت سے واپس گھر لوٹا-

بات واقعی معمولی نہیں تھی جس نے کہن سالہ علی یار خان کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا- پورے گاؤں میں افراتفری سی پھیل گئی تھی اور ہر کوئی بے چین دکھائی دے رہا تھا- علی یار بڑی مشکل سے خود کو سنبھال پایا تھا اور اب اس کے بوڑھے قدم تیزی سے گاؤں کے مرکزی حجرے کی طرف بڑھ رہے تھے- مرکزی حجرہ گاؤں کی اجتماعیت کا واحد مرکز تھا- گاؤں میں شادی بیاہ کے سارے پروگرام اسی حجرے میں ہوتے اور اسی طرح فوتیدگی کی صورت میں یہی حجرہ ہی مرکز ہوتا- گاؤں میں کسی اہم فیصلے کے لئے جرگے کا انعقاد بھی یہاں پر ہوتا- بات کو سننے اور صورت حال کو سمجھنے کے بعد اول اول علی یار کو بہت غصہ بھی آیا تھا مگر اس نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا تھا- مرکزی حجرہ گاؤں کے عین وسط میں واقع تھا اور سارا گاؤں اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا- حجرے سے متصل ایک بڑی اور شاندار مسجد آباد تھی- پورے گاؤں میں یہی واحد مسجد تھی جسے تمام گاؤں والے استعمال کرتے تھے- مختلف اطراف سے آنے والے اکثر راستے اسی مرکزی مقام پر آ کر رکتے تھے- مشترکہ حجرہ، مسجد اور قبرستان پورے گاؤں کی اجتماعیت اور اتحاد و اتفاق کی بڑی علامت تھی- علی یار آٹھ دس منٹ کے اندر حجرے پہنچ چکا تھا اور اب وہ اندر داخل ہو رہا تھا- گاؤں کے دو بزرگ گل اکبر خان اور دلاور خان حجرے میں موجود تھے اور ساتھ ہی کئی ایک نوجوان اردگرد کھڑے احکامات کے منتظر تھے- گاؤں کے سارے اہم فیصلے ان ہی بزرگوں کی خواہش اور مرضی پر ہوا کرتے

تھے۔علی یار کو آتے دیکھ کر نوجوان سامنے سے ہٹے اور وہ سیدھے گل اکبر خان اور دلاور خان کے پاس پہنچ گئے۔اس کی آنکھوں میں شکایت کے ساتھ ساتھ ڈھیر سارے سوالات بھی تھے مگر گل اکبر خان اور دلاور خان نے آنکھیں پھیر لیں۔ وہ ان شکایتوں اور سوالات کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ان کا جواب قطعی اور مختصر تھا۔

علی یار! جو فیصلہ ہوا ہے اس پر عمل کیا جائے۔ مزید باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

علی یار ترپ کر رہ گیا۔اب اس کے پاس خالی ہاتھ لوٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ وہاں سے مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا جہاں اس کے فیصلے حرف آخر ہوا کرتے تھے اور جہاں ہر اہم فیصلے میں اس کی شرکت لازمی تصور کی جاتی تھی۔ احساسات جذبات کے آگے ہار گئے تھے۔

تھکے ہارے قدموں کے ساتھ من من بھر قدم اٹھاتے وہ واپس اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی کمر ٹوٹ گئی ہو اور پیروں میں دم نہیں رہا ہو۔ان کا مکان گاؤں کے شمال میں ذرا بلند مقام پر واقع تھا، یوں کہ وہاں مکان کے سامنے کھڑے ہو کر پورے گاؤں کا نظارہ دیکھا جا سکتا تھا۔سرما کے دن تھے اور ٹھنڈ کے اثرات نمایاں تھے۔گھر کے باہر پڑی چارپائی پر پھیلی دھوپ میں وہ نیم دراز ہو گیا۔سورج بھی آج کے فیصلے سے ناخوش نظر آ رہا تھا، جبھی تو اس کی کرنوں میں آج وہ حدت اور تمازت نہیں تھی۔علی یار چارپائی پر نیم دراز ہو کر گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔بچپن سے لے کر آج تک وہ انہی فضاؤں میں پلا بڑھا تھا۔اس کے آباؤ اجداد بھی یہیں پر زندگی گزار چکے تھے۔ انہی پہاڑوں کی گود میں اس نے جنم لیا تھا۔ انہی تر و تازہ ہواؤں میں پل کر وہ جوان ہوا تھا۔اسی زمین کی سوندھی خوشبو میں اس کی مسیں بھیگی تھیں۔انہی چشموں کا میٹھا پانی خون بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔وہ بھی کیا دن تھے۔محبت، اخلاص، بھائی چارے اور ہمدردی کا جذبہ عام تھا۔چھوٹا سا تو گاؤں تھا۔آبادی بمشکل تین ساڑھے تین سو تک پہنچتی تھی۔سب بھائی بھائی بن کر زندگی گزار رہے تھے۔خوشی اور غمی میں سب ایک دوسرے کے ساتھی اور شریک ہوا کرتے تھے۔ سب کا غم بھی سانجھا اور خوشیاں بھی سانجھی ہوتی تھیں۔ایک گھر کے بچے تمام گاؤں کے بچے اور بزرگ تمام گاؤں کے بزرگ ہوا کرتے تھے۔گاؤں میں نصف سے زیادہ آبادی ان لوگوں کی تھی جو زمینوں کے مالک تھے اور اپنے ذاتی مکانات میں رہتے تھے۔باقی لوگ فقیر نامہ کہلاتے تھے۔ان کی نہ تو زمینیں اپنی تھیں اور نہ ہی مکانات۔یہ لوگ ان مالک لوگوں

کے خالی مکانات میں رہتے تھے اور انہی کے کھیتوں میں کاشتکاری کر کے بیوی بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ ان کی محنت سے ہی کھیت لہلہاتے تھے اور ان ہی کی محنت سے مالکوں کو بیٹھے بٹھائے بغیر محنت کے حصہ مل جاتا تھا۔ بھائی چارے کا ماحول تھا۔ ان کاشتکاروں کو خوب عزت ملتی تھی، ان کی ضروریات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ فصل میں انہیں برابر کا حصہ دیا جاتا تھا، ان کے دکھ سکھ کو اپنا سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ محبت اور احترام کا ماحول تھا۔ لڑائی جھگڑے، تو تکار یا گالم گلوچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سب ایک دوسرے کے گھر عزت اور احترام سے آتے جاتے رہتے تھے۔ کوئی بیمار ہوتا تو پورے گاؤں کی ذمہ داری تھی کہ اسے دوا دارو کے لئے ڈاکٹر کے پاس پہنچائیں۔ بیماری میں ان کے گھروں اور بال بچوں کا خیال رکھتے۔ پورے گاؤں میں کبھی کوئی بھوکا نہ سوتا۔ مالک اور مزارعے ایک جان دو قالب تھے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر خوب ہلا گلا ہوتا اور رنگا رنگ تماشے ہوتے۔ تمام گاؤں شریک ہوتا۔ نوجوان مالک اور مزارعے سب ڈھولک کی تھاپ پر ناچتے اور خوشیاں مناتے۔ گاؤں کے بچوں کا خیال رکھنا سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ علی یار کو اچھی طرح یاد تھا جب مالک احمد علی اپنے بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کر اس کے دروازے پر لایا تھا جس نے کھیل کود کے دوران اس کے بچے کو مارا تھا اور گالیاں دی تھیں۔ احمد علی نے آتے ہی بچے کو علی یار کے حوالے کر دیا تھا کہ یہ آپ کا مجرم ہے اسے سزا بھی آپ ہی دیں گے اور جواباً علی یار نے اس کے بیٹے کو گلے لگایا تھا۔ اسے یاد تھا جب بچپن میں اس کے والد اور والدہ سارے بچوں کو سمیٹ کر کھانا کھانے کے بعد چائے کا سامان اور برتن اٹھا کر پڑوس میں حمید خان کے گھر چلے جاتے۔ وہاں دونوں خاندان اکٹھے بیٹھ کر چائے پکاتے، پیتے اور دیر تک بیٹھ کر گپ شپ لگاتے۔ عجیب سے سکون اور خوشیوں کے دن تھے۔ ایک گھر میں سالن پکتا تو نہ صرف اس کی خوشبو بلکہ ایک پلیٹ سالن بھی آس پاس کے تمام گھروں میں پہنچ جاتا۔

برے دن آتے دیر نہیں لگتی۔ گاؤں کے خوشیوں کو بھی نظر لگ گئی۔ برا ہو الیکشن کا جس نے اس اتحاد اور اتفاق کو پارہ پارہ کر دیا۔ صوبے میں بلدیاتی انتخابات ہو رہے تھے۔ تین گاؤں کو ملا کر ایک یونین کونسل تشکیل دیا گیا تھا اور اس یونین کونسل سے ایک ممبر کو کامیاب ہونا تھا۔ علی یار کے گاؤں سے بھی شریف خان ان انتخابات میں حصہ لے رہے تھے جو بدقسمتی سے ہار گئے۔ دوسرے گاؤں سے اس کا مخالف زیادہ ووٹ حاصل کر چکا تھا۔ ہار شریف خان کا مقدر بن گئی۔ اس شکست کا سارا ملبہ مزارعین پر ڈالا گیا۔

شریف خان نے حجرے میں برملا اعلان کیا کہ فقیر نامہ کے ووٹوں میں سے کچھ ووٹ دوسرے گاؤں کے امیدوار کو پڑے جس کی وجہ سے شریف خان ہار گیا- مزارعین نے بات کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی، قسمیں کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلایا مگر شریف خان کا غم ہلکا نہ ہو سکا- مرکزی حجرے میں پہلی بار ایسے اجلاس منعقد ہوئے جن میں فقیر نامہ کو باہر رکھا گیا، صرف مالکان شریک ہوئے- طویل غور و خوض ہوا، بحثیں ہوئیں اور آخر کار جو فیصلہ سامنے آیا وہ بہت ہی بھیانک تھا- اس فیصلے کے بعد آنے والے خوفناک نتائج کا اندازہ سب کو تھا- محبت ختم ہو جائے گی، خلوص جاتا رہے گا، نفرتیں بڑھ جائیں گی، بیگھٹ پر مزید پیار کے ترانے نہیں گائے جائیں گے- اتفاق ختم ہو جائے گا، لڑائی جھگڑے جنم لیں گے- عزت اور احترام جاتا رہے گا- سب اپنی انا کے لپیٹ میں آ جائیں گے- فیصلہ سننے کے بعد اکبر خان اور نواز علی کے گھر میں بیٹھی گل جانہ اور شمئی کے دل دھک سے رہ گئے- انہیں تو بڑی چاہ کے ساتھ ڈولی میں بٹھا کر ان گھروں کو بیاہ کر لایا گیا تھا مگر اب ان کی وہ عزت اور حیثیت باقی نہیں رہے گی- ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا گیا تھا اور جوڑ بھی مناسب بیٹھ گیا تھا- مزارعین کے گھروں سے گل جانہ اور شمئی عقد ثانی کے طور پر مالکان کے گھروں میں بیاہی گئی تھیں اور انہیں وہاں خوشدلی سے قبول بھی کر لیا گیا تھا- مگر انہیں معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہو چکا تھا! اب انہیں تیز نظروں کا سامنا کرنا ہوگا- طعنے سننے پڑیں گے- انہیں میکے اور سسرال میں سے ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے گا اور بالآخر ان سے ان کا میکہ چھوٹ جائے گا-

فقیر نامہ میں سے ایک معزز بزرگ قدیر بابا کا انتقال ہو چکا تھا- ان کے گھر سے آہ و بکا کی بلند آوازیں پورے گاؤں میں پہنچ رہی تھیں- کفن دفن کی تیاریاں جاری تھیں- حجرے میں لوگ فاتحہ کے لئے جمع ہو رہے تھے- مگر سخت اور بے انصافی پر مبنی فیصلے کی وجہ سے ایک دوسرے سے نظریں چراتے تھے- جنازے کا وقت چار بجے مقرر تھا- وقت مقررہ پر جنازہ ادا ہوا اور لوگ مردے کی چارپائی کو اٹھا کر گاؤں کے برسوں سے قائم قبرستان کے الٹ سمت روانہ ہوئے کیونکہ فیصلے کے رو سے فقیر نامہ کو اپنا مردہ مشترکہ قبرستان میں دفنانے سے روکا گیا تھا- انہیں بتا دیا گیا تھا کہ اب وہ اپنے مردوں کو دفن کرنے کے لئے دوسری جگہ منتخب کر لیں- اب ہمارے مردے ایک ہی قبرستان میں دفن نہیں ہوں گے اور اب گاؤں سے پانچ سو میٹر باہر دوسرے قبرستان کی طرف جنازہ لے جایا جا رہا تھا-

علی یار خاموشی سے جنازے کی بھیڑ سے نکلا اور بوجھل قدموں کے ساتھ دوسرے قبرستان کی طرف چل پڑا -!!!!!!!!!

☆☆☆☆☆

انصاف کا ترازو

اللہ کا فضل ہے کہ میں ابھی ریٹائر نہیں ہوا ہوں۔ اس پر جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔

اپنی اچھی اور کارآمد سرکاری ملازمت کے بعد اپنے پرائے مجھے ایک بے کار چیز، ایک ازکار رفتہ آدمی سمجھنے لگے تھے۔ ہر کوئی مجھ سے کنارا کشی اختیار کرنے لگا تھا۔ میری ذہنی و جسمانی صحت پر شکوک و شبہات اُٹھ رہے تھے۔ وہ لوگ جو میری اہم پوسٹ کی تعیناتی کے دوران مجھ پر وارے نیارے جاتے تھے اور میرے ساتھ تعلق دوستی پر فخر کرتے تھے وہ بھی میری فراغت کے بعد مجھ سے نظریں چرانے لگے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں خود اپنے آپ کو زمین و آسمان کے درمیان معلق محسوس کرنے لگا تھا۔ اللہ کے فضل سے جب سے مجھے نئی ملازمت ملی ہے میں بہت خوش و مطمئن ہوں۔

میں اپنی نئی ملازمت کو دین و دنیا کی بھلائی سمجھ کر نہایت دیانتداری، جان فشانی، قوت ایمانی اور خلوص سے سرانجام دے رہا ہوں، خوش نما ہوں کہ جس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ ایک ریٹائرمنٹ کے بعد، دوسری ناحیات ملازمت کا کبھی میں نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

نئی و پُرکشش ملازمت میں اپنی کارکردگی دیکھ کر خود میں بھی حیران ہوتا ہوں کہ اس خاک کے پُتلے میں اتنی توانائیاں یارب! ابھی باقی تھیں۔ قدرت کے اس عطیے پر ایمان تازہ ہوگیا کہ اس نے دنیا میں اپنی کمزور سی، نحیف و نزار چھوٹی سی مخلوق بھی یونہی بیکار پیدا نہیں کی۔ آپ حیران رہ جائیں گے جو آگے میں آپ کو اپنی مثبت سرگرمیوں، اپنے مشاغل، اپنی کارگزاریوں کا حال بتاؤں گا۔

مجھے تو اُن ریٹائرڈ بوڑھوں پر کبھی ہنسنا اور کبھی رونا آتا ہے جو اپنا شوگر لیول ڈاؤن کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ وقت گزاری کے لیے دُکانوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر بیکار کی بحثیں کرتے ہیں، اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے چینل بدل بدل کر رنگ گورا کرنے والی کریموں کے اشتہار دیکھتے ہیں۔

میرے لیے یہ اللہ کی کتنی رحمت ہے کہ

سید ارشاد حسین شاہ

باوجود کہنہ سالی کے ان لغویات کے لیے ذرا سا بھی وقت مل سکے۔ وقت بے چارہ تو خود مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اور بے کار پڑوں کی عزت ہی کیا ہوتی ہے۔ فارسی کے مقولے کے مطابق "فارغ آدمی کا سر شیطان کا گھر ہوتا ہے" تو اس لعنت سے کیسے خدا نے مجھے بچا رکھا ہے۔

آپ ایسا کیجیے یہ انصاف کا ترازو پکڑ لیجیے اور میری باتوں کو تول کر انصاف کیجیے میں کیا غلط کہہ رہا ہوں۔ سٹھیا جانے کی تو یونہی تہمت ہے۔ بوڑھوں کو بھی یونہی بے کار اور فارغ چھوڑ دیا جائے تو ضروری نہیں کہ اُن کی ساری سرگرمیاں مثبت اور نیک خیالات و نتائج پر مبنی ہوں اور ضروری نہیں کہ اُن کا سارا دھیان گیان سیدھا جنت کی طرف ہو۔ یہ بوڑھے جو عمر رسیدہ ہی نہیں خدا رسیدہ بھی ہوتے ہیں، کائیاں اور زخم خوردہ بھی۔

اور نہیں تو۔ حورانِ ارضی (بیوٹی پارلر سے تازہ تازہ برآمد ہونے والیوں کو) کن انکھیوں سے دیکھنے میں قطعی شرم محسوس نہیں کرتے۔

میں اپنی نئی ملازمت پر بہت خوش ہوں۔

آپ یقین کریں جہاں مجھے ملازمت ملی ہے اتنے شفیق، رحم دل، خوش خلق اور خدا رسیدہ قدر دان ہیں میری تو ہر وقت اُن کے لیے دل سے دعا ہی نکلتی ہے۔ مجھے سب گھر والے چھوٹے بڑے، پیر و جواں اپنے ہی گھر کا فرد خیال کرتے ہیں۔

دیکھیے! انصاف کا پلڑہ آپ کے ہاتھ دیتے ہیں۔ دو وقت کا بہترین کھانا، چائے ہر وقت اور اپنی مرضی کی ٹیلی ویژن سارے گھر والوں کے درمیان بیٹھ کر دیکھنے کی اجازت، مجھے پر اتنا اندھا اعتماد کہ تمام گھر والوں نے کہیں شادی خوشی کی تقریب میں جانا ہو، جو کہ اکثر جاتے رہتے ہیں۔ سارا گھر میرے حوالے، کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ جائیں گے، الماریاں، صندوقیں، زیوروں کے خالی ڈبے، میرے اعتبار پر ہی چھوڑ جائیں گے۔ حتیٰ کہ کھلے گھر کی چابیاں بھی میرے ہاتھ پر رکھ جائیں گے۔ بھلا کون اس زمانے میں ایسا کرتا ہے۔ اپنے محسنوں کے ساتھ میں بھی ذرا سی ہمدردی نہ کروں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ دودھ نہ لا دوں، آخر مجھے بھی تو ملتا ہے اور دودھ کو بغیر اُبالے رکھ دوں، اُس پر جالی نہ رکھوں، اور اُبالنے اور ٹھنڈا ہو جانے پر دودھ کو فریج میں نہ رکھ دوں تو یہ احسان فراموشی نہیں ہو گی کیا؟

یاد رہے انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں ہے۔

الحمد اللہ! میں ایسے انسان نواز اور ہمدرد لوگوں کے گھر میں ملازم ہوں جو خود مجھ سے

ہی پوچھتے ہیں کہ آج کیا پکائیں؟ اُدھر اتنے التفات اور میں سبزی گوشت ہی نہ لاکے دوں۔۔ تُف ہے۔

اور میرا اتنا بڑا مشکل کیا کام ہوتا ہے۔ دو ہی بچوں کو صبح اسکول چھوڑنا، چھٹی کے بعد واپس لانا، آخر خود مجھے بھی تو ٹہلنے، ٹانگیں سیدھی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کیا کہ چند قدم چہل قدمی کی غرض سے ہی سہی۔

میں اسے اللہ کا فضل نہ کہوں تو کیا کہوں؟

آگے سنیے! جس گھر میں مجھے باپ دادا، بزرگ کا مکمل پروٹوکول میسر ہو تو وہاں مجھے اجنبیت کا احساس کیوں ہوگا؟

اور تو اور مجھے اپنے ہم عمر دوستوں سے ملنے کی بھی آزادی ہے۔ ہاں! جاتے ہوئے میں کسی پردہ دار خاتون کو ڈینٹل سرجن کے پاس اس کو دانت دکھانے نہ لیتا جاؤں، کسی کو میکے نہ چھوڑتا جاؤں، تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟

دیکھیے! انصاف کا ترازو میں نے آپ کے ہاتھ میں دیا ہے اسے تھامے رکھیے۔

مجھے ہی جس گھر کا سربراہ اور ولی وارث سمجھا جائے تو میں رات کو جاگ جاگ کر اس گھر کی رکھوالی نہ کروں تو میری شرافت و نمک حلالی سے بعید ہے۔

حد ہے یار! جس گھر کی بڑی اماں، جس کنبے کی سربراہ، گھرانے کی مختار کل، جس کا چار دیواری میں ہر ساکن و غیر ساکن پر حکم چلتا ہو جس کی مرضی کے بغیر پتا نہ ہلتا ہو وہ عظیم ہستی مجھے ہی مجازی خدا کا درجہ دیتی ہو تو ایک ریٹائرڈ آدمی کی اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہوگی؟ اور میں اپنی پنشن کے چند ہزار روپے اُن کے ہاتھ پر رکھ دوں تو اس میں برائی کیا ہے؟

یہ کیا کم ہے بلکہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے مجھے دوسری زندگی دی اور اس قدر توانائی عطا کی کہ میں اپنی نئی ملازمت پر بھاگ بھاگ کر جتنے مشکل کام بھی بھگتاتا ہوں خود پر کسی غیر انسانی مخلوق کا گماں ہونے لگتا ہے۔

میں نے کہا تھا آپ انصاف کا ترازو پکڑے رکھیے۔

اب آپ اس ترازو کو چھوڑ دیجیے کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ دونوں پلڑے برابر ہی نہیں ہو رہے، لہٰذا اس ترازو کو ہی توڑ کر پھینک دیجیے کیونکہ یہ ایک بیکار شے ہے انصاف کی توقع کرنا میری ہی غلطی تھی۔

میں اب جو بھی ہوں جہاں ہوں جس حالت میں جیسا ہوں کی بنیاد پر ٹھیک ہی ہوں۔ اور خوش ہوں کہ

"دوسری ملازمت کس کو ملتی ہے"

☆☆☆☆☆

وبا

کرن اُجالا

کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تو ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔ بس میں سوار ہوئے اُسے پندرہ منٹ ہو چکے تھے جب بیٹھنے کے لیے سیٹ ملی۔ صبح کا وقت تھا اس لیے ابھی مال روڈ پر رش کم تھا۔ کھڑکی سے باہر سڑک پر دیکھتے ہوئے وہ اپنی آج کی ڈیوٹی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بس گورنر ہاؤس کے سٹاپ پر رُکی تھی۔ ایک سمارٹ، خوب صورت حلیے کی لڑکی، اپنے گورے چہرے پر ماسک اور بلیک گلاسز لگائے تیزی سے بس میں سوار ہوئی۔ اُس کے بوائے کٹ بالوں اور ماڈرن حلیے نے کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکتی ندا کی توجہ اپنی جانب کھینچی۔ کوئی سیٹ خالی نہ ہونے کی وجہ سے وہ ندا کے پاس سے گزر کر بس کی ونڈ سکرین کے قریب لگے راڈ کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ اب اُس کی پشت ندا کی طرف تھی۔ ندا کی نظروں نے غیر ارادی طور پر اُس کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اُس کے بالوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”اس قدر چھوٹے بال۔۔ آخر کیا وجہ ہو گی اتنے چھوٹے بال کٹوانے کی۔“ وہ حیران سی سوچنے لگی۔ ”مجھے یہ نارمل کیوں نہیں لگ

رہی۔۔۔ اس کے بال۔۔۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے مکمل گنج کے بعد بال اتنے ہوئے ہیں۔۔۔ ایک، ڈیڑھ انچ لمبے۔۔۔ ورنہ اتنی شارٹ کٹنگ بھلا کون عورت کرائے گی۔"

ندا سوچتی رہی اور جائزہ لیتی رہی۔ اسی دم اُس smart and young looking نے دائیں جانب چہرہ گھمایا تو ندا نے دیکھا بلیک گلاسز میں چھپی اُس کی آنکھوں پر گہرا میک اپ اور کاجل ہے۔ اُس کی بھنویں بھی مکمل طور پر میک اپ سے بنی ہوئی تھیں۔ چہرے پر لگی میک اپ فاؤنڈیشن بھی اس سلیقے سے لگی تھی کہ دور سے معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ چہرے پر کوئی میک اپ بھی ہے۔ ندا نے دل ہی دل میں اس سلیقے کی داد دی۔ مفلر کی صورت لپٹے ہوئے زنگالی رنگ کے ریشمی دوپٹے نے اُس کی گردن کو چھپا رکھا تھا۔ زنگالی سبز پھول دار قمیص اور سادہ میچنگ شلوار کے تنگ پائنچوں کے ساتھ ہی جب ندا کی نظر اُس کے پیروں پر پڑی تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا اُسے اور اُس نے فوراً آنکھیں پورے زور سے بھینچ کر کھولیں تھیں۔ گہرے سانولے، جھریوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے پاؤں، ناخنوں پر لگی، اُکھڑی اُکھڑی سی سرخ نیل پالش اور نہایت خستہ حالت کے پرانے ویج سینڈل (wedge sandals) نے ندا کو مزید اُلجھا دیا تھا۔ سینڈل کی حالت بالکل ایسے تھی جیسے کسی کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھائے گئے ہوں۔

"اُف خدایا! یہ کیا چکر ہے۔ یہ عورت تو کسی ڈرامے کا کردار لگ رہی ہے۔" اس عورت کے پاؤں کی جلد دیکھ کر ندا نے فوراً اُس کے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا جس سے اُس نے قدرے دائیں جانب لگے راڈ کو پکڑا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ بھی اُس کے پیروں کی طرح اُس کی عمر کی چغلی کھا رہے تھے۔ ہاتھوں اور پاؤں کی جلد بتا رہی تھی کہ وہ اپنی زندگی کی لگ بھگ چھے دہائیاں گزار چکی ہے۔ ہاتھوں کے ناخنوں پر لگی نیل پالش بھی پاؤں کے ناخنوں کی طرح جگہ جگہ سے اُکھڑی ہوئی تھی جیسے لگائے ہوئے دو ہفتے گزر چکے ہوں۔ ندا نے پھر اُس کے پاؤں کی طرف دیکھا اور یقین کرنا چاہا کہ جو وہ دیکھ رہی ہے واقعی سچ ہے یا اُس کی نظر کا دھوکا۔

ابھی سوچوں میں تھی کہ نیلا گنبد کے سٹاپ کا اعلان ہو گیا۔ "ایکسکیوزمی! آپ یہاں آ جائیں اس سیٹ پر" ندا نے کھڑے ہو کر اُس عورت کے کاندھے پر ہاتھ سے دباؤ ڈال کر متوجہ کیا۔ وہ پلٹی تو ندا نے بہت غور سے ماسک کے اطراف میں سے نظر آتا اُس کا چہرہ دیکھا۔ اب وہ قریب سے بہتر دیکھ پائی تھی کہ میک اپ فاؤنڈیشن بیس (base) نے اُس کی گہری سانولی رنگت ہی نہیں بوڑھی جلد کو بھی خوب ڈھانپ رکھا

تھا۔ "کیا خوب کردار ادا کرنے لگا ہے یہ ماسک بھی۔" وہ اُسی کے بارے میں سوچتی ہوئی ہسپتال میں داخل ہوئی تھی۔

ڈیوٹی ختم ہونے میں ابھی پندرہ، بیس منٹ ہی باقی ہوں گے جب بس میں ملنے والی عورت ندا کی ساتھی ڈاکٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ بنا کچھ کہے اُس نے اپنے بلیک گلاسز اُتارے۔ ماسک ایک کان سے اُترا اور وہ دوسرے کان سے لٹک گیا۔ اُس کی ایک آنکھ پتھر کی تھی اور اُوپر کا ہونٹ آدھا کٹا ہوا۔۔۔۔

"اِس وبا نے بھی کتنوں کا بھلا کر دیا ہے ناں۔ منہ چھپانے کا بڑا Valid reason دے دیا ہے۔" رات کی شفٹ اور دن کی ڈیوٹی کے بعد روزینہ نے کمرے میں آ کر دستانے اور ماسک اُتار کر میز پر رکھا اور منہ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف آئی۔ اُس کی بات سن کر ندا مسکرائی اور صرف ہاں کہنے پر اکتفا کیا۔ روزینہ نے منہ دھو کر اچھی طرح تولیے کی ٹشو پیپر سے اپنا چہرہ تھپتھپا کر خشک کرنے لگی۔ ندا نے سٹیتھو سکوپ گلے میں لٹکایا، ماسک کے اوپر ایک اور ماسک پہنا، دستانے پہنے اور وارڈ کی طرف چلی گئی۔ روزینہ نے کرسی پر بیٹھ کر پانی کا گلاس بھرا اور ایسے پیا جیسے صدیوں سے پانی نہ ملا تھا۔ گلاس میز پر رکھ کر اُس نے ایک طویل سانس کھینچا۔ تھکن سے اُس کا برا حال تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اُس نے کنپٹیوں کو دبایا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

رات بھر ایک مریضہ کی خراب حالت نے اُسے لمحہ بھر کے لیے بھی سونے نہ دیا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی ڈاکٹر عدنان نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ جوان لڑکی جو خودکشی کی کوشش کے بعد دو دن سے ہسپتال میں پڑی تھی، بچ سکے لیکن اس کی زندگی کے لمحے آخری سانسیں لے چکے تھے۔ آج صبح ہی اُدھر مؤذن نے اللہ اکبر کی آواز بلند کی اور اِدھر اُس کی روح کو رہائی کا پروانہ مل گیا۔ اُس کی ماں دھاڑیں مار مار کر روئی تھی۔ اُس کی ماں کی حالت دیکھ کر روزینہ کی بھی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"وہ بچ بھی جاتی تو۔۔۔ نہ زندوں میں ہوتی نہ مُردوں میں۔۔۔" عدنان نے دھیمی آواز میں روزینہ کو تسلی دینے کے لیے کہا اور خود بھی بوجھل دل کے ساتھ واش روم کی طرف چلا گیا۔

"اچھا ہوا مر گئی۔ منحوس نے جینا حرام کر دیا تھا ہمارا۔۔۔" ایک غصیلی مردانہ آواز نے گالی کے ساتھ اپنا جملہ ختم کیا تھا۔ روزینہ نے مڑ کر دیکھا۔ نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں درمیانے قد کا ایک مرد، چہرے پر نفرت اور غصہ سجائے اُس لڑکی کی ماں سے مخاطب تھا۔ "کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اِس مردود نے۔ کہہ دینا رشتے داروں سے کورونا سے مر گئی۔۔۔ اور ہاں! ڈاکٹرنی سے اس کے لیے ماسک لے لینا۔ غسل کے بعد اس کے منہ پہ لگانا ہے۔"

☆☆☆☆☆

مٹکے سے دریا کی کہانی

دنیا میں ناممکن کچھ نہیں ہوتا اور یہ بھی سچ ہے کہ

slow and steady wins the race.

اتفاق میں برکت ہے۔ ایمان داری کا پھل اور ایسی سینکڑوں کہاوتیں جس تیزی سے معنویت بدل رہی تھیں، اس کی کہانی تو نہیں لیکن اپنی خیرہ کن چمک دمک سے آنکھوں کے ساتھ دماغ بھی چندھیا دیتی ہیں۔ فی زمانہ کوئی عمل ناجائز نہیں تھا۔ دلیلیں مساجد میں اذان کے مقابلہ میں گونجتی تھیں۔ اب صرف دو کہاوتوں کا ڈنکا بجتا تھا۔ ایک "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" اور دوسری "جنگ اور محبت میں سب جائز ہے"۔

ہر بھدے عمل کے جواز میں ایک تواتر سے جنگ اور محبت میں سب جائز کا راگ یوں الاپا گیا کہ سب کو قومی ترانہ بھول گیا۔ انھیں ایسی روشن خیالی درکار تھی، جس کے لیے وہ سماجی گھٹن کا رونا رو کر اپنی محرومی واضح کر سکیں۔ چنانچہ شہر میں جب بھی کہرام مچتا----- ماسک پہن کر گدھ چڑیا، فاختہ یا کونج کا شکار کرتے اور اودھم مچاتے، سب کھلی آنکھوں سے یہ ظلم دیکھتے اور خاموش رہ کر اور اس ایموجی پوسٹ کرنا کافی سمجھتے۔ اصل دہائی تو یہ تھی کہ باز بھی ان کا ہی ساتھ دیتے۔

شہر بھر کے مچھیرے بھی اسی روشن خیالی اور سماجی گھٹن کے تھری ڈی کارڈ سجا کر مردہ مچھلیوں کی اس بساند کو دبانے کی کوشش کرتے جو دریا کے پانی میں زہر پھیلا رہی تھی۔ پانی کی بوتلوں پر جدت کے انوکھے سیدھے لیبل سجا کر انھیں صرف اس بات میں دلچسپی تھی کہ کسی طرح یہ آلودہ پانی شہر بھر کے پائپوں میں بہنے لگے۔

دریا کی روانی، کشتی، بادبان اور دریا پر لکھے گئے دل چسپ اشعار نے اور دریا کے بھنور اور کنارے کے دلفریب بیان نے شہر میں اوگھتے مٹکوں کو جیسے جھنجھوڑ ڈالا۔ مٹکوں کی نظر نہ تو اپنے ظرف پہ گئی اور نہ ہی انھوں نے اپنے دامن کی وسعت کا اندازہ لگایا۔ حد تو یہ کہ انھوں نے گھڑے کی تہہ سے لگے پانی کے ان چار قطروں کو بھی نظر بھر کے نہیں دیکھا جو شرم سے ڈوب مرنے کے

سعدیہ بشیر

لیے بھی کافی نہ تھا۔ حقیقت کو بدلنے کے خطوط پر کام کرتے ہوئے منکوں نے بھی اجلاس بلانے میں ہی سہولت سمجھی۔ شہر بھر کے چھوٹے بڑے گھڑے اور منکے اجلاس میں قسمت بدلنے کی امید پر شامل ہوئے۔ ان کے دل میں زیر خانہ یہ خواہش بھی موجود تھی کہ اس رستے پہ ان کے دن پھرنے والے ہیں۔

اجلاس میں شامل ہر منکا سردار قرار پایا اور لفظوں کے ہیر پھیر سے ان سب کو یکساں فضیلت سے نوازا گیا۔ ایک منکا تو دریائے راوی پر کامران کی بارہ دری کی کہانی سن کر اتنا exited ہوا کہ اس کی رال ٹپکنے لگی۔ اسے لگا کہ اب اسے دریا بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن اس کی نظر میں چلو بھر پانی نے جالا سا تان دیا۔ ایک آہ رساء گلوگیر انداز میں نکلی اور اس نے آہستگی سے خود کلامی کی۔ گنجی دھوئے گی کیا اور نچوڑے گی کیا؟!!!!

ایک دانا منکے نے یہ سرگوشی سن لی اور مائک پر نہایت دانش مندانہ جواب دیا۔ اس نے حاضرین منکوں کو آمادہ عمل کرتے ہوئے کہا کہ ان کو اپنی نظر پانی کی کمی اور وسعت قلب کے بجائے اہداف پر رکھنا چاہئے آخر درخت کی شناخت اس کے پھولوں اور پتوں سے ہوتی ہے، اس کے سائے سے نہیں۔ مثال دیتے ہوئے اس نے کہا کہ کیکر، تھور اور ببول بھی تو درختوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

دریا میں تیرتی رنگین مچھلیوں نے اس کے ذہن میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ یہ جواب آنے والی نسلوں کی تشفی کے لیے کافی تھا۔ تمام منکوں نے ہاؤ ہو کا ایک زوردار نعرہ لگایا جس سے چھوٹے گھڑوں کے پیندوں میں سوراخ ہو گئے۔ کاروباری نقطہ نظر سے یہ کوئی اتنا بڑا عیب نہیں تھا۔ اس لیے انھیں اپنی قیمت گرنے کا شائبہ تک نہ ہوا۔ پانی کی سطح بلند کرنے کے ایک پڑھے لکھے منکے نے سب کو سیانے کوے کی کہانی سنائی۔ اس نے اپنے لیکچر میں اس ویڈیو کو بھی شامل کیا جو کسی ستم ظریف نے سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کر دی تھی۔ اس کا مقصد جو بھی ہو لیکن اس سے کووں کی مارکیٹ ویلیو میں اضافہ ہوا اور ان کی شہرت چہار دانگ پھیل گئی۔ چنانچہ کووں کو بھی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ ایک کوا جس نے رنگین پروں کی ایکسٹینشن لگا رکھی تھی اور کوے سے زیادہ خود کو مور سمجھ رہا تھا۔ اس نے تمام کووں کی طرف سے سوشل میڈیا کی اس پذیرائی پر شکریہ ادا کیا۔ آخر اسی کی بدولت منکوں نے

ان سے رابطہ کیا تھا۔ کوے کی گھڑے میں کنکر ڈالتے ہوئے یہ ویڈیو اتنی وائرل ہوئی کہ ہر چھوٹے بڑے ہر گھڑے اور مٹکے نے اسے اپنے موبائل پر محفوظ کر لیا تھا اور ادھر ادھر بھیج کر خود کو دریا ثابت کرنے کے امکانات پر توجہ مبذول کروانے میں مگن تھے۔ جوش جذبات میں انھوں نے اس بات پر توجہ ہی نہ دی کہ کوا جس گھڑے میں کنکر ڈال رہا تھا، وہ animated تھا۔ ذرا اور تحقیق کرتے تو ابن انشا کی "اردو کی آخری کتاب" میں سیانے کوے کی جدید کہانی بھی پڑھ لیتے لیکن یہاں تجسس و تحقیق کی زحمت ہی کسے تھی۔ پہلا خبری بننے کے لالچ نے انھیں وہ لٹو بنا دیا تھا جو چار تماشائی دیکھ کر گھومنے لگتا تھا۔

مٹکوں کے دریا بننے کی خواہش اب خبر بن چکی تھی۔ تالاب، ندی، نالوں اور چشموں کے لیے کوئی اور چارہ نہ بچا تو انھوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے خود کو سمندر کہلوانے پر اصرار کیا اور بحیرۂ مردار کی تصاویر لگا کر فخر کرنے لگے۔ گاؤں کے جوہڑ اور شہر کے گندے نالے بھلا کیسے پیچھے رہتے۔ انھوں نے خود کو PH.D کی شفاف اعزازی ڈگری سونپ ڈالی۔ سمندر اور دریاؤں کی کسے پرواہ تھی۔ عبداللہ غازی جیسے ولی اللہ کی روایت کا سہارا لے کر سمندر کی حدود کا تعین کیا گیا۔ دریا کے متعلق سوچ لیا گیا کہ وہ خود ہی اپنا راستہ بدل لیں گے آخر ماضی میں بھی تو ایسا ہوتا رہا ہے۔ دریا پہ بند باندھنے کے لیے بھی کچھ ویڈیوز موجود تھیں۔ دریائے راوی کی مثال دے کر دریاؤں کو الٹی میٹم دیا گیا کہ ضعف عمری نے ان کی ہیبت میں دراڑ ڈال دی ہے۔ اب وہاں شعبدہ بازوں کا قبضہ تھا اور وہ پھونکوں کے بل پر دنیا بدلنے کا عزم رکھتے تھے۔ دریا نے سمندر اور سمندر نے آہ بھر کر دریا کو دیکھا۔ پانی کنارے سے ٹکرایا اور ریت میں جذب ہو گیا۔ ساحل پر پھیلی گندگی منانے کی خواہش آنسو بن کر رہ گئی۔ بھنور اور طوفان پہ البتہ ان کا اختیار نہ تھا کچھ عوامل پہ قدرت کی طاقت دائمی ہے۔ جب سے مٹکے کووں کے جمع شدہ کنکروں اور پتھروں کو سطح آب میں اضافہ سمجھتے ہیں اور خود کو دریا کہلوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مردم شماری کے جدید خطوط کے مطابق مٹکے، الا آب اور جوہڑ کو بدرجہ رتبہ دریا، ندی اور تالاب قرار دیا گیا ہے لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ اب انھیں سمندر کہہ کر لکھا اور پکارا جائے۔

☆☆☆☆☆

زندگی کا تقاضا

افسانہ: نٹ ہیم سن
ترجمہ: پیروز بخت قاضی

Knut Hamsn نٹ ہیم سن ناروے کے شہر LOM لوم میں 1859 میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن شمال میں گزرا جہاں کے مناظر اس کے حقیقت پسند ناولوں اور کہانیوں میں ملتے ہیں۔ گزر بسر کے لیے کئی پیشے اختیار کیے۔ کلرک، جفت ساز، خوانچہ فروش، بحری جہاز کا مزدور، شیرف، ٹیچر، جہاں گشت وغیرہ۔ دو بار امریکہ جا کر دو برس صرف کیے۔ پھر اس کی توجہ کہانی کار بننے پر مرکوز ہو گئی۔ سکنڈے نیوین ممالک کے ادب میں اس نے بھوک اور فاقہ زدہ آدمی کی ذہنی کیفیت کو بیان کر کے توجہ حاصل کر لی۔ آوارہ گردی کے بجائے دیہی آسائش حاصل کرے، ہیم سن نے The Growth of the soil تحریر کی جس پر اسے 1920 کا ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ صنعتی جمہوری معاشرے کی مخالفت میں اسے اپنے ملک پر حملہ آور نازیوں کا ہم خیال کہا گیا۔ نازیوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اس کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ اپنی بزرگ سنی کے باعث قید کی سزا سے بچ گیا لیکن اس کی

تمام دولت چھین لی گئی۔ نفسیاتی معائنہ کے لیے اوسلو کے سیتی تورم میں بھیج دیا گیا۔ رہائی کے بعد وہ Grims tad کے قریب اپنی جاگیر پر واپس لوٹ آیا، جہاں 1952 میں اس کا انتقال ہو گیا۔ The Call of life اس کی تحریر کردہ کہانی ہے، جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

کوپن ہیگن کی اندرونی بندرگاہ کے نزدیک ویسٹرن وولڈ سٹریٹ نسبتاً نیا بولیوارڈ ہے جہاں آبادی نہ ہونے کے برابر ہے اور ویرانے کا سماں رہتا ہے۔ یہاں چند ایک مکانات ہیں، گنتی کے روشنی کے لیمپ ہیں اور لوگوں کی آمدورفت بالکل نہیں۔ آج کل گرمیوں کے موسم میں بھی شاذ و نادر ہی کوئی گزرتا ہوا انسان نظر آتا ہے۔

میں نے سڑک کنارے چند ایک چکر لگائے تھے، جب ایک خاتون کو مخالف سمت سے اپنی سمت آتے دیکھا۔ دور دور تک کوئی اور انسان نظر نہیں آتا تھا۔ اگرچہ گیس کے لیمپ روشن ہو چکے تھے لیکن پھر بھی اندھیرا پھیلا تھا۔ روشنی اتنی کم تھی کہ میرے لیے آنے والی خاتون کا چہرہ پہچاننا مشکل تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ "رات کی کوئی راہی ہو گی" اور میں اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔

بولیوارڈ کے آخری سرے پر پہنچ کر میں پیچھے کی طرف مڑا اور واپس چلنے لگا۔ خاتون بھی آگے جانے کے بعد واپس مڑ چکی تھی، لہٰذا میں پھر اس سے ملا۔ شاید وہ کسی کے انتظار میں تھی۔ مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں بھلا وہ کس کی منتظر ہے۔ اسی خیال میں دوبارہ اس کے پاس سے گزرا۔ جب وہ تیسری مرتبہ میرے پاس پہنچی تو میں نے تعظیماً اپنے ہیٹ کو چھوا اور اس سے مخاطب ہوا

"کیا آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟"

وہ اچانک پریشان سی ہو کر بولی "نہیں...... میرا مطلب ہے ہاں مجھے کسی کا انتظار ہے۔"

"متوقع شخص کی آمد تک اگر میں آپ کا ساتھ دوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا؟"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور واضح کیا کہ دراصل اسے کسی کا انتظار نہیں اسے محض تازہ ہوا چاہیے اس حبس کے ماحول میں۔

ہم ساتھ ساتھ ٹہلتے رہے اور مختلف موضوعات پر لایعنی گفتگو کرتے رہے۔ پھر میں نے اپنا بازو اس کی جانب بڑھایا۔

"نہیں، شکریہ!" وہ سر نفی میں ہلا کر گویا ہوئی۔

اس طرح ٹہلنے میں کوئی تک نہ تھی۔ میں

اندھیرے میں اسے دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھنے کے لیے دیا سلائی جلائی اور کچھ دیر جلائے رکھی تاکہ اسے دیکھ سکوں۔

"ساڑھے نو بجے ہیں۔" میں نے بتایا۔

وہ کانپ رہی تھی جیسے سردی سے ٹھٹھر رہی ہو۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا

"آپ سردی سے کانپ رہی ہیں؟" میں نے دریافت کیا "کیا ہم کسی جگہ رک کر کوئی مشروب نہ پی لیں؟" ریوالی میں یا پھر نیشنل میں؟"

"لیکن کیا آپ دیکھ نہیں سکتے کہ میں اس حالت میں کہیں بھی نہیں جا سکتی۔" اس نے جواب دیا۔

تب میں نے پہلی بار غور سے دیکھا کہ اس نے بہت لمبا سیاہ نقاب پہن رکھا تھا۔ میں نے معذرت کی اور اندھیرے کو اپنی غلطی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اور جس طرح اس نے فوراً میری معذرت قبول کر لی اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ عام طور پر آوارہ پھرنے والی رات کی راہی عورت نہیں ہو سکتی۔

"کیا آپ میرا بازو نہ پکڑیں گی؟" میں نے دوبارہ تجویز دی۔ "اس سے آپ کو کچھ گرمائش حاصل ہو گی۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا۔

کچھ دیر مزید ہم آگے پیچھے ٹہلتے رہے۔ اس نے مجھے دوبارہ گھڑی پر وقت دیکھنے کی فرمائش کی۔

"اب دس بج گئے ہیں" میں نے کہا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"گیملے کون گیوی پر۔" میں نے اسے روک لیا۔

"کیا میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ آؤں؟ میں نے پوچھا۔

"نہیں یہ مناسب نہ ہو گا" وہ بولی "نہیں! میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی.....

آپ بریڈ گیٹ پر نہیں رہتے کیا؟"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اوہ! میں جانتی ہوں آپ کون ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

پھر ہم دونوں خاموش اور بازو میں بازو ڈال کر روشن گلیوں میں سے گزرتے گئے۔ وہ تیز تیز قدم بڑھا رہی تھی اور اس کا لمبا لباس اس کے پیچھے لہرا رہا تھا۔

"بہتر ہو گا ہم تیز تیز چل کر جلدی پہنچ جائیں۔"

گیملے کون گیوی پر اپنے دروازے تک پہنچ کر میری طرف مڑی جیسے اسے گھر تک پہنچانے کے لیے وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی

ہو۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا جس میں آہستہ سے وہ داخل ہوگئی۔ میں نے بھی اپنے کندھے سے دروازے کو آہستہ سے دبایا اور اس کے پیچھے اندر داخل ہوگیا۔ اندر پہنچتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم دونوں چپ تھے۔

ہم دو منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر جا کر رُک گئے۔ اس نے خود اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے کا تالا کھولا، پھر ایک دوسرا دروازہ کھولا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ یہ غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ میں دیوار پر لگے کلاک کی ٹک ٹک سن رہا تھا۔ ایک دفعہ اندر داخل ہوگئے تو خاتون نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر اچانک اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر کے گرمجوشی سے براہ راست میرے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا جبکہ اس کا سارا وجود جذبات سے کانپ رہا تھا۔

"کیا آپ بیٹھیں گے نہیں؟" اس نے تجویز کیا "یہاں اس صوفے پر؟ میں اس اثنا میں روشنی لے کر آتی ہوں" اور اس نے ایک لیمپ جلا دیا۔

میں نے حیران اور متجسس نگاہوں سے آس پاس دیکھا۔ میں ایک کشادہ اور نہایت آراستہ ڈرائنگ روم میں تھا۔ دوسرے نیم وا دروازے دوسرے کمروں میں کھلتے تھے۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میرا کس قسم کی شخصیت سے آمنا سامنا تھا۔

"کیسا خوبصورت کمرہ ہے" میں بولا "کیا آپ یہاں رہتی ہیں؟"

"ہاں یہ میرا گھر ہے۔"

"یہ گھر آپ کا ہے؟ تب تو آپ اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہوں گی۔"

"اوہ نہیں!" وہ ہنس کر بولی۔ "میں ایک بڑی عمر کی عورت ہوں۔ جیسا کہ آپ ابھی دیکھیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے نقاب اور اوپر والا لبادہ اتار دیا۔

"یہاں ـــــ دیکھیں! میں نے کیا غلط کہا تھا؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک کسی بے قابو جذبہ کے تحت مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

وہ بائیس برس کی ہوگی یا تئیس برس کی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حقیقتاً شادی شدہ عورت ہوگی۔ خوبصورت؟ نہیں، اس کے چہرے پر بھورے بھورے داغ تھے اور اس کی بھنویں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ لیکن اس میں زندگی کا جوش اُبل اُبل پڑتا تھا اور اس کے ہونٹوں اور دہانے میں عجیب قسم کا حسن تھا۔

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے، اس کا کوئی شوہر ہے تو وہ کہاں ہے، یہ کس کا گھر

ہے، جس کے اندر میں موجود ہوں۔ میں جب بھی بولنے کی کوشش کرتا وہ اپنا وجود مجھ پر گرا دیتی اور میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتی اور اس طرح مجھے کوئی سوال کرنے سے روک دیتی۔

"میرا نام ایلین ہے" اس نے بتایا۔ کیا آپ پینا پسند کریں گے؟ اگر میں گھنٹی بجاؤں گی تو آواز کسی کے آرام میں مخل نہ ہوگی۔ اگر اس کے دوران آپ ادھر بیڈ روم میں آ جائیں تو بہتر ہوگا۔"

میں بیڈ روم میں چلا گیا جس میں ڈرائنگ روم کی تھوڑی تھوڑی روشنی آ رہی تھی۔ کمرے میں دو بیڈ لگے تھے۔ ایلین نے گھنٹی بجائی اور شراب لانے کو کہا۔ اور میں نے خادمہ کی شراب لے کر آنے اور پھر کمرے سے باہر جانے کی چاپ سنی۔ تھوڑی دیر بعد ایلین میرے پیچھے بیڈ روم میں آ گئی لیکن دروازے میں رُک گئی۔ میں نے اس کی جانب قدم بڑھایا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی وہ میرے قریب آ گئی۔

یہ تھی گزشتہ شام کی سرگزشت۔

اس سے آگے کیا ہوا؟ صبر! ابھی آگے بہت کچھ ہے۔

میری آنکھ کھلی تو آج کی صبح طلوع ہونے والی تھی۔ پردے کے دونوں طرف دن کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ ایلین بھی جاگ گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کے بازو سفید اور ویلوٹ جیسے ملائم تھے۔ اس کی چھاتی کا بھرپور ابھار نمایاں تھا۔ میں نے اس سے سرگوشی کی تو اس نے میرا منہ اپنے نرم و نازک ہونٹوں کے خاموش مَس سے بند کر دیا۔ دن روشن سے روشن تر ہو رہا تھا۔

دو گھنٹوں کے بعد میں اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ ایلین جاگ چکی تھی اور کپڑے پہن رہی تھی..... اس نے شوز بھی پہن لیے تھے۔ پھر مجھے ایسا تجربہ ہوا جو ایک ڈراؤنے خواب کی مانند ابھی تک مجھ پر اثر انداز ہے۔ میں واش سٹینڈ کے پاس کھڑا تھا جب ایلین نے کسی کام سے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اسی لمحے میں نے منہ موڑا اور اندر جھانکا۔ کمرے کی ایک کھلی کھڑکی سے سردی کا تھپیڑا میری طرف لپکا۔ میں نے کمرے کے درمیان ایک میز پر پڑی لاش دیکھی ..... تابوت میں سفید کپڑے میں لپٹی میز پر ایک آدمی کی لاش پڑی تھی جس کی داڑھی کے بال زیادہ تر سفید ہو چکے تھے۔ اس کے استخوانی گھٹنے اس طرح ابھرے ہوئے تھے جیسے کسی نے چادر

کے اندر مٹھیاں بھینچ کر اشارہ کیا ہوں۔ اس کے چہرے پر زردی اور نا آسودگی کے آثار چھائے تھے۔ میں دن کی پوری روشنی میں یہ منظر دیکھ رہا تھا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

جب ایلین واپس ہوئی تو میں کپڑے پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی بانہوں میں لے کر وہ میرے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی تھی لیکن میں کوئی ردعمل ظاہر کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس نے اوپر مزید لبادے اوڑھ لیے۔ وہ میرے ساتھ گلی کے دروازے تک جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے آنے دیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ دروازے پر وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ ”اچھا خدا حافظ“ وہ منمنائی۔

”کل تک؟“ میں نے دریافت کیا۔ میں اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

”نہیں کل نہیں“ ”کل کیوں نہیں؟“

پیارے اتنے سوالات نہ پوچھو۔ کل میں نے ایک جنازے میں شرکت کرنی ہے۔ میرا ایک رشتہ دار فوت ہو گیا ہے۔ اب معلوم ہو گیا کہ کل کیوں نہیں؟“

”ہاں! پرسوں یہیں دروازے پر میں تم سے ملوں گا۔ خدا حافظ۔“ اور میں چلا گیا۔ وہ کون تھی؟ اور وہ لاش؟ جس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور منہ کے کونے نیچے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے۔ کتنا خوفناک اور مضحکہ خیز منظر تھا۔ پرسوں وہ میری منتظر ہو گی۔ مجھے پھر ملنے کے لیے جانا چاہیے؟

میں سیدھا بریٹینا کیفے پہنچا اور ڈائریکٹری طلب کی۔ میں نے گمبلے کون گیوی کے فلاں فلاں نمبر کو تلاش کیا..... اور وہاں نام لکھا تھا۔ میں نے کچھ وقت انتظار کیا حتیٰ کہ صبح کا اخبار آ گیا۔ میں نے جلدی جلدی اخبار میں اموات کے اعلانات کا کالم ڈھونڈا۔ ہاں! وہاں میں نے اس خاتون کا اعلان بھی پڑھا جو فہرست میں پہلے نمبر پر موٹے حروف میں شائع ہوا تھا ”میرے ترپن سالہ شوہر طویل علالت کے بعد آج انتقال کر گئے......“ اعلان پر ایک روز پہلے کی تاریخ درج تھی۔

میں دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔

ایک آدمی شادی کرتا ہے۔ اس کی بیوی عمر میں اس سے تیس برس چھوٹی ہے۔ وہ ایک طویل بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک خوشنما دن وہ وفات پا جاتا ہے۔“

اور جوان بیوہ سکھ کا سانس لیتی ہے۔

☆☆☆☆☆

غزل

شاخ در شاخ تجھے لاد دیا پھولوں سے
میری خوشبو کہے آئے گی تری سانسوں سے

اَن گنت دُکھ مری اک چپ میں سمٹ آئیں گے
لوگ اندازے لگائیں گے تری باتوں سے

لب اُلجھتے ہی ترے سانس اُلجھ جاتے تھے
چھپتا پھرتا تھا ترا چور، مری نظروں سے

گونج اک عکس کی ہے گنبدِ تنہائی بھی
کتنی قوسیں ہیں کہ ملتی ہیں تری قوسوں سے

دائرہ دائرہ قوسوں میں گھرا ہوں کب سے
کتنے ڈورے ہیں کہ اُلجھے ہیں مری آنکھوں سے

فاصلے درد کا احساس نہیں کم کرتے
ہر قدم چھاؤں ٹپکتی ہے گھنے پیڑوں سے

میری نس نس میں ترے لمس کی لو گرداں ہے
روشنی ہے مرے لفظوں میں ترے بوسوں سے

ڈھونڈ ویران حویلی کے دریچوں میں انہیں
پوچھ ٹوٹے ہوئے پتوں کا پتہ جھونکوں سے

یہ مچلتی ہوئی لہریں ہیں کہ چاندی کے پہاڑ
کچھ عجب رنگ اُبھرتے ہیں ترے خاکوں سے

دوست بھی چھوڑ نہ جائیں مجھے باری باری
سبھی ملتے ہیں تری طرح کھلی باہوں سے

شہر میں آگ لگا کر بھی وہ یہ چاہتا ہے
کوئی آواز تک آئے نہ گلی کوچوں سے

مار ڈالے گی مجھے ذلتِ خواہش خالد
قتل ہو جائے گا اک عہد ترے ہاتھوں سے

خالد احمد

غزل

لڑے ہیں نین ہی ایسے، صنم نہ بھولے گا
وہ اپنا یار مرا محترم نہ بھولے گا

بدلنا اور اچانک ، عجب تماشا ہے
جفا کے بعد تمہارا کرم نہ بھولے گا

دیا سلام محبت خزاں نے پتّے پر
کیا ہے دستِ ہوا نے رقم ، نہ بھولے گا

ندیمؔ و فیضؔ نے نظم و غزل کو چمکایا
انھیں زمانہ خدا کی قسم نہ بھولے گا

ہوئے ہیں کتنے بہت شاعری کے دیوانے
ہمیں کلام فرازؔ و عدمؔ نہ بھولے گا

نئے مزاج کی جدت ہے خالدؔ احمد کی
لکھا جو اس نے وہ کاغذ قلم نہ بھولے گا

قلم سنبھال کے لکھتے رہو جو یوں ثاقبؔ
تمھارے شعر کا یہ کیف و کم نہ بھولے گا

آصف ثاقب

غزل

کوئی کب تک کسی کے ساتھ چلے؟
کوئی رستا تو اپنے ساتھ چلے!!

میں کنارا ہوں جس بھی دریا کا
اُس سے کہہ دو کہ میرے ساتھ چلے

ہم سفر تھے بھی اور نہیں بھی تھے
ہم عجب فاصلے سے ساتھ چلے

کیا یقیں تھا کہ جس کی خاطر ہم
ہر نئے واہمے کے ساتھ چلے

فاصلوں میں کمی نہیں آئی
راستے بھی ہمارے ساتھ چلے

ایک منزل تھی یوں تو دونوں کی
تُم کسی ، ہم کسی کے ساتھ چلے

اُن کی آنکھیں بھی جگمگاتی ہیں
تو تری روشنی کے ساتھ چلے

دو کناروں کی مثل دریا کے
ہم صدا زندگی کے ساتھ چلے

اُس کی منزل کہیں پہ ہے ہی نہیں
وہ جو ہر راستے کے ، ساتھ چلے

دُھوپ ایسی ہے ، کیا کہیں امجدؔ
اپنا سایا نہ اپنے ساتھ چلے

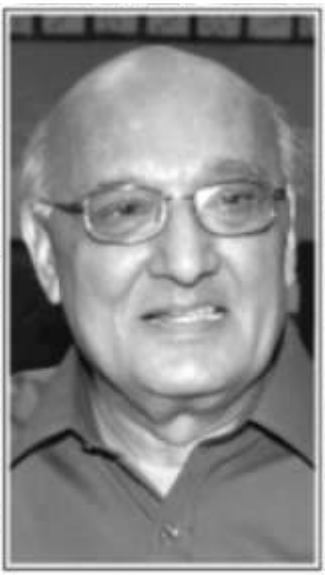

امجد اسلام امجد

غزل

اِدھر لالے پڑے ہیں شہر کے واں گھر کا ڈر ہے
ہمیں دستار کی ہے فکر اُس کو سر کا ڈر ہے

کسی دشمن سے ہم تسخیر ہونے کے نہیں ہیں
خود اپنی ہی صفوں کے صادق و جعفر کا ڈر ہے

میں جس کو دُور کر دینے کی دُھن میں ڈھ رہا ہوں
فقط اک میری کٹیا کا نہیں گھر گھر کا ڈر ہے

سرِ بحرِ زماں آنے کو ہے طوفان ایسا
کہ اب کے بادبانوں کا نہیں لنگر کا ڈر ہے

کسی باہر کی آندھی کا نہیں کچھ خوف لیکن
در و دیوار سے لپٹا ہوا اندر کا ڈر ہے

کسی سے دشمنی اپنی نہیں ہے شہر بھر میں
کبھی تھا ماتھا جس کا ہاتھ اُس کے شر کا ڈر ہے

زمانوں سے چلا آتا ہے اپنے ساتھ عالیؔ
عجب اک خواب میں دیکھے ہوئے منظر کا ڈر ہے

جلیل عالی

غزل

سب میسر ہے مگر اس میں "نہیں ہے" کی تلاش
خوب ہوتی ہے کسی شے میں کسی شے کی تلاش

اپنی بستی ہے مگر اس میں قدم تا بہ قدم
خوف کرتا ہے سرائیت کو رگ و پے کی تلاش

ایک اک بوند سے پیمانہ بھرا ہے میں نے
کتنی آنکھوں میں اترتی ہے بڑے کی تلاش

حرف میں صوت میں بھی انفس و آفاق میں بھی
گیت ہی گیت ہیں جاری ہے مگر لے کی تلاش

دل کربلا اسے پایا تو کہیں ختم ہوئی
وہ جو رہتی تھی ہمیشہ سے "کوئی ہے" کی تلاش

احتیاطاً ہی سہی ڈھونڈیے آئینے میں
شکل و صورت میں اگر ہے غمِ در پے کی تلاش

بات ہوتی ہے تو کھلتا ہے زمانے کا مزاج
کس کو "ہے ہے" سے غرض ہے کسے "جے جے" کی تلاش

زندگی کارِ مسلسل ہے قناعت کیسی
روز اس شے کی تمنا کبھی اس شے کی تلاش

ہر ضرورت سے جڑی کوئی ضرورت ہے کنور
سانس میں سُر ہو تو رہتی ہے ہمیں نے کی تلاش

اعجاز کنور راجہ

غزل

پاک مٹی میں ملا پانی ، بنا اور دیا
حجرۂ جاں میں جلا تو بھی ذرا اور دیا

بوئے گل پھیلی اگر صحنِ چمن میں شب بھر
ڈھل گئے نور کے پیکر میں صبا اور دیا

اک دیا طاق پہ رکھا بھی اندھیرا ہے وہی
کتنی تاریک ہوئی رات ، جلا اور دیا

سحر آگیں تھا وہ منظر کہ جو دیکھا میں نے
شاخ پر غنچے چٹکنے کی صدا اور دیا

اپنے انجام سے بیگانہ ہوئے ہیں دونوں
بے اماں دشت میں کیا بانگِ درا اور دیا

وہ کہ محبوب تو ہے ، حورِ شمائل نہ سہی
دستِ نازک پہ رکھے آیا دعا اور دیا

لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا ہے تصور میں حسنؔ
ہم رکاب آئے مرے گھر میں ہوا اور دیا

حسن عسکری کاظمی

غزل

خود اپنے ہی جادو میں گرفتار ہے کیسی!
کیا کہیے کہ وہ چشمِ فسوں کار ہے کیسی

سناٹا مسلّط بھی ہے اِس شہر پہ کیسا!
ہلچل بھی مگر کچھ پسِ دیوار ہے کیسی

نفرت کے سمندر میں جزیرے کی طلب ہے
مت پوچھو، محبت تجھے درکار ہے کیسی

یہ شہر کہ مدّت سے ہے اِک شہرِ خموشاں
اِس شہر میں یہ رونقِ بازار ہے کیسی؟

یہ دل پہ غمِ ہجر کی ہر لمحے کی یورش
یہ پھول پہ چلتی ہوئی تلوار ہے کیسی!

اِس شہر میں یہ سایۂ اشجار ہے کیسا
یہ آگ برستی تہِ اشجار ہے کیسی

یہ کیسا جنوں مجھ میں ہے آزاد روی کا؟
یہ مجھ پہ گرفتِ در و دیوار ہے کیسی

سہلاتی بھی ہے زخم، مجھے زخم لگا کر
حیرت ہے، یہ دنیا بھی اداکار ہے کیسی!

لکھی جو غزل مَیں نے تجھے دھیان میں لا کر
اے جانِ غزل، اے مرے دلدار، ہے کیسی؟

قیدی کوئی گزرا ہے کہ برپا ہے کوئی جشن
کانوں میں یہ زنجیروں کی جھنکار ہے کیسی

آثار تو منزل کے نظر ہی نہیں آئے!
کچھ روز سے یہ تیزیِ رفتار ہے کیسی؟

دُعا نظر انداز جو کرتی تھی ہمیشہ
اب رسمِ پذیرائی پہ تیار ہے کیسی!

دروازے بھی اکثر نظر آتے ہیں اِسی میں
حائل مرے رستے میں یہ دیوار ہے کیسی

پہنا ہوا مدّت سے ہے جب طوقِ غلامی
پھر دل میں بھلا خواہشِ دستار ہے کیسی

اَسرارِ محبت کے سمجھ میں نہیں آتے!
راحت بھی ہے، لیکن یہی آزار ہے کیسی

نسیمِ سحر

غزل

سرِ سطحِ زمیں تھا یا تہِ افلاک ہوتا تھا
میں دستِ کوزہ گر سے پہلے مُشتِ خاک ہوتا تھا

شجر سے کٹ کے رستے میں پڑا ہوں جبرِ موسم سے
میں اس سے پیشتر اس حُسن کی املاک ہوتا تھا

اسے تیرے در دولت پہ پھیلاتا گیا لیکن
مجھے کوتاہ دامانی کا بھی ادراک ہوتا تھا

نکل کر دشت سے آبادیوں کی نذر ہونے تک
میں جیسا تھا مگر آلائشوں سے پاک ہوتا تھا

بہت کھیلا ہوں مل کر موجۂ سیلِ رواں سے میں
رضی میں ڈوبنے سے پیشتر تیراک ہوتا تھا

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر رنج تری عطا تھا خالد
ہر دکھ اک در بے بہا تھا

غزل

جب سے عشاق میں مشتہر ہو گئے
عشق کے ضابطے معتبر ہو گئے

یوں تو پہلے سے طے تھا ہر اک فیصلہ
چند نقطے اِدھر سے اُدھر ہو گئے

منزلوں کے تعین کی بس دیر تھی
راستے سب کے سب پُرخطر ہو گئے

جیسے جیسے بڑھی بے نیازی تری
اپنے شکوے گِلے مختصر ہو گئے

پہلے خود کو سفر پر روانہ کیا
پر تعاقب میں گردِ سفر ہو گئے

دل میں رہتے تھے جو دردِ دل کی طرح
رفتہ رفتہ وہی دردِ سر ہو گئے

بے وفائی کی تاریخ لکھی گئی
جتنے غدار تھے وہ امر ہو گئے

مخبری بھی محبت کا فیضان ہے
جو نہ عاشق ہوئے نامہ بر ہو گئے

شاہین مفتی

غزل

پرندے کوچ کرتے جا رہے ہیں
ہمارے گھر اُجڑتے جا رہے ہیں

کوئی لکھے گا کیا نوحہ ہمارا
سبھی جاں سے گزرتے جا رہے ہیں

ہماری کہکشاؤں سے ستارے
بڑی تیزی سے بچھڑتے جا رہے ہیں

ابھی تو روشنی پھوٹی تھی گھر میں
ابھی سے سائے بڑھتے جا رہے ہیں

مکانی لامکانی ہو گئی ہے
سبھی منظر بدلتے جا رہے ہیں

کسی نے صور تو پھونکا نہیں ہے
مگر پھر بھی اجڑتے جا رہے ہیں

جمالِ دوستاں ، اہلِ میسر
یہ بادل اب سرکتے جا رہے ہیں

اوریا مقبول جان

غزل

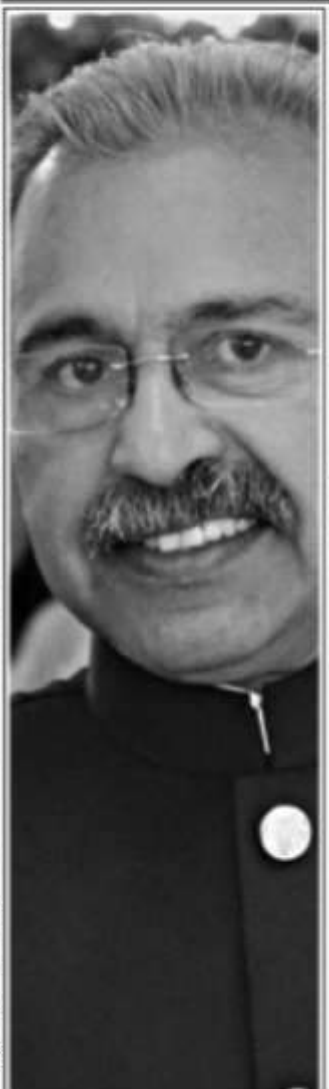

نوک بنیاد شکستہ پہ دھرے ہیں ہم بھی
ایک گرتی ہوئی دیوار ارے ہیں ہم بھی

اوڑھ رکھی ہے غموں نے وہ قبائے رنگیں
دیکھنے والوں کو لگتا ہے ہرے ہیں ہم بھی

دل کے ٹکڑوں کو سمیٹا تو یہ معلوم ہوا
ایک نادیدہ جراحت سے مرے ہیں ہم بھی

کھوٹے سکے کی طرح کر دیا اس نے واپس
تھی غلط فہمی ہماری کہ کھرے ہیں ہم بھی

ایسا لگتا ہے کوئی دیکھ رہا ہو جیسے
لاکھ دنیا کی نگاہوں سے پرے ہیں ہم بھی

ناز ہے تجھ کو اگر لعل و جواہر پہ تو سُن
روح تک درد کی دولت سے بھرے ہیں ہم بھی

رات پھر جیسے تعاقب میں کوئی ہو راحتؔ
اپنی آہٹ سے کئی بار ڈرے ہیں ہم بھی

راحت سرحدی

غزلیں

گذر گئی ہے یہیں پر نہ جانے کیا کیا کچھ
ابھی ہے عرشِ بریں پر نہ جانے کیا کیا کچھ

سبک خرام ہیں ذی روح سب زمانے میں
پڑا ہے بار ہمیں پر نہ جانے کیا کیا کچھ

در زمانہ سے سر کو اُٹھایئے صاحب!
چپک گیا ہے جبیں پر نہ جانے کیا کیا کچھ

ہمارے واسطے اِک گوشۂ اماں رکھیو
بھگت چکے ہیں زمیں پر نہ جانے کیا کیا کچھ

وہ ہاں کہے نہ کہے پر ہمیں تو اے خاورؔ
گماں ہیں اُس کی نہیں پر نہ جانے کیا کیا کچھ

خاور اعجاز

غمِ جہاں سے گذرنے کی راہ لیتے ہیں
زمیں کی تہ میں اُتر کر پناہ لیتے ہیں

بساطِ دہر پہ کھیلے ہُوئے ہیں ہم بھی بہت
پیادہ دیتے ہیں اور بادشاہ لیتے ہیں

خموش بیٹھے ہیں جو آشیاں میں ہیں سارے
ہمیں قفس میں ہیں لیکن کراہ لیتے ہیں

اجل یہ کہتی ہُوئی آئی میرے تکیے پر
کبھی تو خیر خبر خیر خواہ لیتے ہیں

فقیر لوگ ہیں، کرتے نہیں گلہ شکوہ
جو آن پڑتی ہے دل پر، نباہ لیتے ہیں

غزل

نہ تھا ایسا ، میں جیسا ہو گیا ہوں
جہاں کہتا ہے کیسا ہو گیا ہوں

کسی انجان دھن میں غرق ہو کر
بجا تھا اور بے جا ہو گیا ہوں

مقید ماضی و امروز میں تھا
غبار راہ فردا ہو گیا ہوں

تب و تاب زمانہ سے الجھتے
کسی دشمن کا لہجہ ہو گیا ہوں

کہا تھا جس نے "ذرہ" میں اُسی کی
"ستارہ" چشمِ تر کا ہو گیا ہوں

مقدر دیکھیے کشتِ جفا کا
وفا کا اِس میں پودا ہو گیا ہوں

اُمیدوں حسرتوں کے زیر و بم میں
میں خود اپنا تماشا ہو گیا ہوں

تلاشِ ہم سفر کی آرزو میں
زمانے بھر میں تنہا ہو گیا ہوں

نہیں ہوں آفریںؔ دنیا سے خائف
شقاوت سے شناسا ہو گیا ہوں

رشید آفریں

غزل

دُوسرے کی بھی کچھ سُنو ہو تم
یا فقط اپنی ہی کہو ہو تم

کس کی آنکھوں میں ہے قیام، کہو
کون سے دل میں اب رہو ہو تم

رہ دکھاتے ہو رہروؤں کو ، یا
دو قدم ساتھ بھی چلو ہو تم

کیا غضب ہے کہ سچ بھی بولو ہو
اور انجام سے ڈرو ہو تم

توبہ ، توبہ، انیسِ جاں ، توبہ!
کیسا انصاف یہ کرو ہو تم

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرم نوا رہتے ہیں

غزلیں

جس سفینے کا ناخدا ہی نہیں
اس کو ساحل کبھی ملا ہی نہیں

اک قیامت گزر گئی ہم پہ
آپ کہتے ہیں کچھ ہوا ہی نہیں

زندگی شعلۂ تپاں بھی ہے
زندگی موجۂ صبا ہی نہیں

ٹھہریے آپ جا رہے ہیں کہاں
حالِ دل تو ابھی کہا ہی نہیں

مطلبِ اشک و آہ کیا سمجھے
آتشِ غم میں جو، جلا ہی نہیں

جس میں ہم سانس لے سکیں کھل کر
اب وہ ماحول، وہ فضا ہی نہیں

ہاں ہمیں کو تھا شوقِ بربادی
آپ کی تو کوئی خطا ہی نہیں

کس طرح ہو علاجِ کج فہمی
اس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

سُن کے رودادِ غم وہ کہتے ہیں
پھر کہو میں نے کچھ سنا ہی نہیں

بچ کے رہنا جلالؔ یاروں سے
ہیں یہ ظالم بھی، بے وفا ہی نہیں

سید قاسم جلال

ہاں خوشی کی تو وہ تھوڑی سی رمق دیتے ہیں
ہے یہ افسوس بصد درد و قلق دیتے ہیں

صبح تو اُن سے گریزاں نہ ہو اپنے خوں سے
جو ترے رخ کو سدا رنگِ شفق دیتے ہیں

ہم ہیں اس مدرسۂ فکر میں داخل کہ جہاں
زندگی بھر جو نہ بھولے وہ سبق دیتے ہیں

ہم وہ بیمار ہیں لکھ کر وہ جنہیں نسخے میں
قرصِ توبہ کی، ندامت کا عرق دیتے ہیں

گر یہ نیت ہے کہ اس پر کہیں قائم رہنا
حلف نامے کا ابھی پھاڑ ورق دیتے ہیں

چھیننا پڑتا ہے یہ قوتِ بازو سے جلالؔ
ورنہ غاصب کہاں مظلوم کو حق دیتے ہیں

غزل

بیٹھا ہوں میں پڑھ کر ابھی مضمون تمہارا
ممنون تھے تم میرے ، میں ممنون تمہارا

اشعار یہ اُترے ہیں محبت میں تمہاری
میرا تو ہے دیوان بھی مرہون تمہارا

لُوٹا بھی مجھے تم نے تو مجرم بھی میں ٹھہرا
جاگیر تمہاری میں ہے قانون تمہارا

ظاہر تو کیے جاتی ہیں آنکھیں یہ تمہاری
جذبہ جو محبت کا تھا مکنون تمہارا

جاتے ہو جہاں شام کو تم اشک بہانے
مرقد میں بھلا کون ہے مدفون تمہارا

ظالم کو بُرا کہنے پہ ہوتے ہو خفا کیوں
لگتا ہے کہ کچھ لگتا ہے ملعون تمہارا

دولت کے پجاری تھے! ذرا اُٹھ کے بتا دو
کتنا بُرا انجام تھا ، قارون تمہارا

حلیہ تو بنا رکھا ہے ، سُنت کے مطابق
اچھا ہے جو باطن بھی ہو مسنون تمہارا

بیٹھا ہے ضیاؔء در سے چوکھٹ پہ تمہاری
سینے سے لگا لو کہ ہے مفتون تمہارا

سید ضیا حسین

غزلیں

جہانِ رنگ و بُو میں جی رہا ہوں
تمھاری آرزُو میں جی رہا ہوں

ہوں اپنے آپ سے بچھڑا ہوا میں
میں اپنی جستجو میں جی رہا ہوں

کھٹکتا ہوں رقیبوں کی نظر میں
نگاہِ خوب رُو میں جی رہا ہوں

تصوّر میں ہے اک زُلفِ معنبر
فضائے مشکبُو میں جی رہا ہوں

مسخر کر چکا ہوں اپنی کٹیا
تلاشِ کاخ و کُو میں جی رہا ہوں

یہی تو ہے دلیلِ فتح یابی
کہ میں قلبِ عدُو میں جی رہا ہوں

میں مر کر بھی ہوں زندہ محفلوں میں
کسی کی گفتگو میں جی رہا ہوں

شوکت محمود شوکت

موسم ہے سرد سرد، تو خنکی ہوا میں ہے
ساحل، کوئی نہاں کسی موجِ بلا میں ہے

مدّت کے بعد، کوئی ہے مائل بہ التفات
شاید کہ خستگی سی، فصیلِ انا میں ہے

اب عشق و عاشقی کے زمانے گزر گئے
اہلِ جنوں سمجھتے ہیں، سب کچھ وفا میں ہے

اپنے بھی آج، لشکرِ اعدا میں ہیں شریک
تنہا کوئی حُسین، کسی کربلا میں ہے

وہ ایک شخص آج بھی دیکھا مکینِ دل
وہ ایک شخص آج بھی شاملِ دعا میں ہے

ہر پل نگاہ ناز میں ہیں شوخیاں لیے
ہر لحظہ، اک قیامتِ صغریٰ ادا میں ہے

دنیا کی رونقوں میں نہ اس کی تلاش کر
شوکت سکونِ قلب تو ذکرِ خدا میں ہے

غزل

رات ہو تو دیا بناتے ہیں
حبس ہو تو ہوا بناتے ہیں

اپنی حاجت کو سامنے رکھ کر
اپنا اپنا خدا بناتے ہیں

آ نکلتے ہیں چند رہرو بھی
ہم فقط راستہ بناتے ہیں

فن پہ ہوتی ہے اک ندامت سی
جب کوئی آپ سا بناتے ہیں

تیری تصویر ابھر کے آتی ہے
ہم فقط اک خلا بناتے ہیں

کچھ لگاتے ہیں بات کو تڑکا
بات کا ذائقہ بناتے ہیں

ہم کو امید ہے کہ برسے گی
آج ہم جو گھٹا بناتے ہیں

آئیں مل جائیں سارے حاجت مند
کوئی حاجت روا بناتے ہیں

وصل کے انتظار میں ہر روز
ہم نیا زائچہ بناتے ہیں

کس قیامت کے لوگ ہیں وہ لوگ
جو تجھے ہم نوا بناتے ہیں

پھر لرزتی ہیں اونچی دیواریں
ہم تو ثاقبؔ صدا بناتے ہیں

منظور ثاقب

غزل

تُم سے پُرکیف ہے زبانِ غزل
تُم سراپا غزل ہو ، جانِ غزل

وہ بڑھاتے ہیں اس کی شان سدا
جن کے اِدراک میں ہے شانِ غزل

کہکشاں کا گمان رہتا ہے
اِتنا پُرنور ہے جہانِ غزل

روک لیجے صدائیں نظموں کی
سُن رہا ہُوں ابھی اذانِ غزل

شاعروں نے اِسے عروج دیا
مہ رُخوں نے بڑھائی شانِ غزل

لُطف آتا نہیں بطرزِ کمال
کچھ سُقم ہوں جو درمیانِ غزل

کچھ علاقہ نہیں ہمیں مَے سے
ہم تو رہتے ہیں شادمانِ غزل

دل نوازی سبھی کا شیوہ ہے
کیسا پیارا ہے خاندانِ غزل

گلستاں آگے بڑھ کے ملتے ہیں
جب نکلتا ہے کاروانِ غزل

جب بھی چاہیں کریں خریداری
بند ہوتی نہیں دکانِ غزل

شوخ غزلیں اُنہی کے دم سے ہیں
خاص ہوتی ہیں جو زنانِ غزل

شاذ ہی کوئی ہو گا محفل میں
جس طرح ہم ہیں مدح خوانِ غزل

مرکزِ فکر ہیں ہیں دگر اَصناف
مرکزِ دل ہے آستانِ غزل

میری خوش قسمتی کہو راشدؔ
مل گیا ہے جو اَرمغانِ غزل

ممتاز راشد لاہوری

غزلیں

گل خوشی سے نہال دیکھتے ہیں
راہ باد شمال دیکھتے ہیں
کیا مصور بنانے جا رہا ہے
آؤ اس کا خیال دیکھتے ہیں
کون لائے گا اب مثال تری
ہم تجھے بے مثال دیکھتے ہیں
کیسے کیسے حسین چہرے ہیں
کوزہ گر کا کمال دیکھتے ہیں
ترا اب بھی جواب مہمل ہے
منتظر ہے سوال دیکھتے ہیں

سہی سہی ہے ہر خوشی ہر سو
ہر سو غم کی دھمال دیکھتے ہیں
اس کی خواہش تھی اس کو روکتا میں
اب ہے دل میں ملال دیکھتے ہیں
جس کے جلوے جلیلؔ ہر جانب
اسکا حسن و جمال دیکھتے ہیں

احمد جلیل

ترے جمال سے سوچیں خیال لیتی ہیں
مری غزل کے یہ تیور اجال لیتی ہیں

ہوا ہے جب بھی زمانہ کبھی خلاف مرے
تری رفاقتیں مجھ کو سنبھال لیتی ہیں

تمھارے آنے سے کھلتے ہیں گلشنوں میں گلاب
بہاریں تجھ سے ہی باد شمال لیتی ہیں

بکھیر دیتے ہیں جب بھی وہ اپنی زلفوں کو
سیاہ راتیں اندھیروں کی شال لیتی ہیں

تمھارے حسن کا جب چاند جگمگاتا ہے
سمندروں میں بھی لہریں دھمال لیتی ہیں

ہمارے شہر کا راوی تو چین لکھتا ہے
تو پھر رُتیں یہ کہاں سے وبال لیتی ہیں

جواب دیتی نہیں ہیں مگر کسی کو جلیلؔ
نظر نظر سے وہ آنکھیں سوال لیتی ہیں

غزلیں

آئینہ اس کو بنا، پھول کھلا، پانی میں
عکس پانی میں اتار، آگ لگا، پانی میں

ہاتھ پانی میں جو ڈالے، تو غضب ڈھانے لگے
اور بھی کھلنے لگا، رنگِ حنا، پانی میں

پانی کے پیالے کو آ، شہد سے میٹھا کر دے
تو نظر ڈال ذرا، اگلی بلا، پانی میں

موجزن ہوتا ہے پھر یاد کا دریا کیسے
اٹھ کے کاغذ کی تو کشتی تو چلا، پانی میں

اکرم ناصر

پھر کوئی ڈوب گیا کچا گھڑا، پانی میں
تیرتی دیکھی گئی ایک ردا، پانی میں

باپ کی بات نہ مانی، تو نبی کا بیٹا
باپ کے سامنے ہی ڈوب گیا، پانی میں

ایک لشکر تھا تعاقب میں جو غرقاب ہوا
ایک لشکر تھا جسے رستہ دیا، پانی میں

قافلے والے، کہ پیاسے تھے کنار دریا
ہائے کم بخت کہ غیرت نہ حیا، پانی میں

اس میں جو بچہ ہے، پہنچے گا تری گود میں ہی
حوصلہ رکھ ذرا صندوق بہا، پانی میں

خشک کھیتی سے تو گزرے گی یہ چپکے چپکے
اور برسے گی کہیں دور گھٹا، پانی میں

رات اندھیاری تھی، بادل تھے، سمندر کا سفر
گر گیا ہاتھ سے جب سمت نما، پانی میں

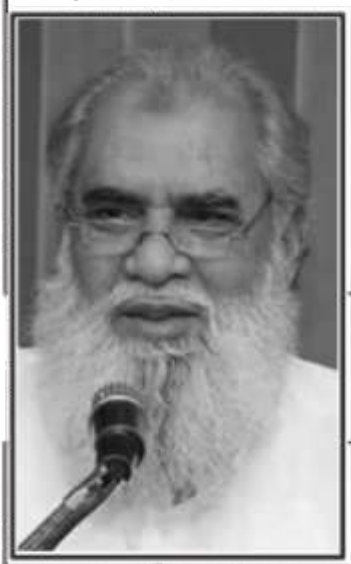

ایک پیاسے کو ہوا پانی عطا، صحرا میں
اور پھر سب کے لئے رکھ دی شفا، پانی میں

فرش تو صاف تھا یوں، جیسے کہ ٹھہرا تالاب
چلنے کا سوچتی تھی، ملکہ صبا، پانی میں

سننے والے نے، سر عرش بریں بھی سن لی
پیٹ میں مچھلی کے، مانگی تھی دعا، پانی میں

وہ خدا ہے، اسے زیبا ہے یہ اکرم ناصر
پانی رکھتا ہے ہوا میں، تو ہوا، پانی میں

غزل

آنکھ کے دریچے میں رتجگوں کی بارش تھی
تو نہیں تھا پلکوں پر آنسوؤں کی بارش تھی

چاند کی تمنا میں گھر سے میں نکل آیا
جبکہ میرے آنگن میں جگنوؤں کی بارش تھی

قیس اور میں دونوں پھر رہے تھے آوارہ
زندگی کے صحرا میں وحشتوں کی بارش تھی

مجھ کو خوب رونا تھا اس لئے میں لوٹ آیا
آج اس کی محفل میں قہقہوں کی بارش تھی

اک طرف اکیلا میں لڑ رہا تھا فاقوں سے
دوسری طرف دل میں خواہشوں کی بارش تھی

مر گئے تو لوگوں نے ہم پہ پھول برسائے
جب تلک رہے زندہ پتھروں کی بارش تھی

کون کون آیا تھا کیا خبر سروبہؔ جی
رات بھر مرے دل پر دستکوں کی بارش تھی

اقبال سروبہ

غزلیں

اشارے پر نہ رُکنے کا عمل بتلا رہا ہے
کہ اب تنبیہ کا موسم گزرتا جا رہا ہے

نہیں ہے جرم گردوں کا کوئی اس کے علاوہ
کہ گزرے وقت کا ہر سانحہ دہرا رہا ہے

بہت ہی محترم وہ شخص ہے میری نظر میں
جو مجھ کو زندگی کرنے کا گر سکھلا رہا ہے

اُسی سے پوچھ لو کہ ہجر کیسا تجربہ ہے
ترے بخشے ہوئے زخموں کو جو سہلا رہا ہے

رہِ ظلمت میں سنگِ راہ بن کر ہی جیو تم
چراغِ راہ بجھ کر بھی یہی سمجھا رہا ہے

ابابیلیں کسی کے حکم کی پھر منتظر ہیں
کسی جانب سے کوئی ابرہہ پھر آ رہا ہے

مقدر ہو چکا اس کا دُرِ نایاب ہونا
مقید ہو کے سیپی میں جو غوطے کھا رہا ہے

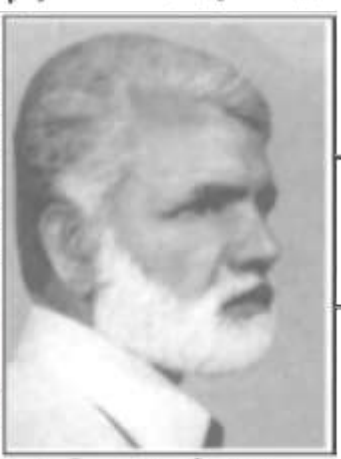

یعقوب پرواز

اُس کا بیٹا جب تنی رسّی پہ چلنے لگ گیا
بازی گر فرطِ مسرت سے اُچھلنے لگ گیا

جان مٹی میں پڑی اور سبزگی ظاہر ہوئی
زرد چہرے کھل اُٹھے، منظر بدلنے لگ گیا

اے خدا! اُس کو بھی اِس نعمت سے مالا مال کر
میری شہرت دیکھ کر جو مجھ سے جلنے لگ گیا

ایک اک مہرے کی فطرت سے ہے آگاہی اُسے
وقت کی شطرنج پر جو چال چلنے لگ گیا

پھٹ پڑا ہے یوں کسی کے جبر کا آتش فشاں
"منجمد یادوں کا لاوہ جب پگھلنے لگ گیا"

مجھکو ایسے خیر خواہ سے لینا دینا کچھ نہیں
جو کہ آتے ہی مری قسمت بدلنے لگ گیا

مل گیا ہے مجھکو اپنی خوش گمانی کا صلہ
جو گریزاں تھا کبھی، اب ساتھ چلنے لگ گیا

غزل

نادریّت ذرا دیکھو اس کی
حاکمیت ذرا دیکھو اس کی

مجھ سے ملتے ہی خدا ہو جانا
نرگسیت ذرا دیکھو اس کی

اس نے کرنا تھا کنارا مجھ سے
زاہدیت ذرا دیکھو اس کی

اتر آتی ہے کوئی قوسِ قزح
رانگیت ذرا دیکھو اس کی

داد دیتا ہے ہلا کر پاؤں
صاحبیّت ذرا دیکھو اس کی

بند آنکھوں سے بھی در آتا ہے
جارحیت ذرا دیکھو اس کی

سعدؔ اب مجھ کو وہ سر کہنے لگا
اجنبیت ذرا دیکھو اس کی

سعد اللہ شاہ

غزلیں

اس طرح دل کا زخم کھلا بارشوں کے بعد
کھلتی ہے جیسے قوسِ قزح بارشوں کے بعد

دیتی ہے جانے کتنے کواڑوں پہ دستکیں
چلتی ہے جب بھی تیز ہوا بارشوں کے بعد

ہوتے ہیں پہلے کتنے عذابوں کے سلسلے
آتی ہے کام ماں کی دعا بارشوں کے بعد

ہونٹوں کی پیاس دل کی کدورت تمہاری یاد
ڈھل جاتی ہے ہر ایک دوا بارشوں کے بعد

اک بار کھل کے رونے کا ہے فائدہ شکیلؔ
ہوتی ہے صاف ساری فضا بارشوں کے بعد

شکیل اختر

یوں تو ہوئے ہیں ہم پہ کئی وار مختلف
لیکن انا کی جنگ ہے اس بار مختلف

اس شہرِ بے اماں میں ہیں کچھ اور لوگ بھی
دو چار میرے جیسے ہیں دو چار مختلف

کہنے کو کامیاب کہانی ہے زندگی
انجام ایک جیسا ہے کردار مختلف

کچھ اور ہونے والا ہے اہلِ جنوں کا حشر
مجھ کو دکھائی دیتے ہیں آثار مختلف

دیوار پر ہے نقش جو کچھ اور ہے شکیلؔ
لکھا گیا ہے کچھ پسِ دیوار مختلف

غزل

اِک در بدری ہے مرا گھر کوئی نہیں ہے
ہاں ہاں یہ سبھی اپنے ہیں ، پر کوئی نہیں ہے

چاہت کے گھروندے کی منڈیروں پہ دیے ہیں
آہٹ بھی سنی دل نے مگر کوئی نہیں ہے

میں اپنے سے ناراض ہوں خود سے ہی خفا ہوں
خود خود کو منا لوں گی اگر کوئی نہیں ہے

لگتا تھا دعاؤں میں اثر ہو گا مری بھی
لگتا ہے دعاؤں میں اثر کوئی نہیں ہے

کچھ ہوتا کسی کو تو خبر مجھ کو بھی ہوتی
وہ خیر سے ہو گا جو خبر کوئی نہیں ہے

یہ زندگی کیا شے ہے ، سفر کیسا ہے اس کا
چلتے ہیں سبھی راہ گزر کوئی نہیں ہے

کس کا ہے کرشمہ جو نظارے نظر آئے
کیسے یہ کہیں ہم کہ اُدھر کوئی نہیں ہے

ہم کو کوئی زندان سے یادوں کے نکالے
دیواریں بہت اونچی ہیں در کوئی نہیں ہے

شبہ طراز

غزلیں

عہدِ رفتہ کا ماتم نئے سال میں
ہیں پرانے وہی غم نئے سال میں

بھاگتے جا رہے ہیں ستارے ادھر
جا کے لیں گے کہیں دم نئے سال میں

وقت سے وقت مل جائے گا، دیکھنا
اور بچھڑ جائیں گے ہم نئے سال میں

لو پکڑ لو یہ انگلی مرے خواب کی
آؤ چلتے ہیں باہم نئے سال میں

میرے حامدؔ، ہو کیوں اتنے بے تاب تم
کیا ملیں گے نئے غم نئے سال میں!

حامد یزدانی

بہارِ جاں فزا کے بعد کیا ہے
ابھی سے کیوں پرندہ سوچتا ہے!

ازل کے دن سے ہی سینے میں ہے دل
ازل کے دن سے ہی محشر بپا ہے

اگر ملنا تمہارا وہم سا تھا
بچھڑنا بھی تمہارا خواب سا ہے

بدلتے جا رہے ہیں عکس کیونکر
وہی مَیں ہوں، وہی یہ آئنہ ہے

یقیں مانو، کہیں جل تھل نہ ہو گا
یہ بادل بارہا برسا ہُوا ہے

مرے چاروں طرف پھیلا یہ دریا
مرے ہی رُخ اچھلتا آ رہا ہے

ستارہ ہے وہ کوئی اور حامدؔ
جہاں شب کا نظارہ جا بسا ہے

غزل

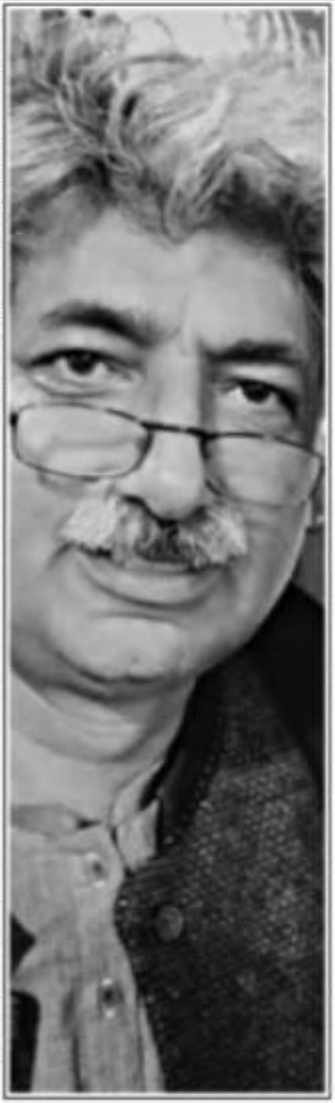

مکرر ، واہ واہ ، ارشاد ، سے توڑا گیا ہے
غرور خوش بیانی داد سے توڑا گیا ہے

میں تیرا جسم مہکانے میں تھوڑا وقت لوں گا
مجھے شاخِ دل برباد سے توڑا گیا ہے

تنے بستر سے مجھ کو باندھ کر میرا تعلق
کسی لطفِ بدن کی یاد سے توڑا گیا ہے

اب اس ملبے سے اپنے ہجر کے حجرے بنیں گے
محبت کا مکاں بنیاد سے توڑا گیا ہے

مری تنہائی کو بے انتہا کرنے کی خاطر
مرا رشتہ مرے ہمزاد سے توڑا گیا ہے

مشینوں میں اُسے ڈھالا ہے خود ہاتھوں سے ہم نے
بھرم ہاتھوں کا جس فولاد سے توڑا گیا ہے

تجھے اے خوش بدن!! ایسیں نہیں، میں لطف دوں گا
مجھے کیکر نہیں شمشاد سے توڑا گیا ہے

کبیرؔ اک آدھ ہوتا تو میں قائل کر بھی لیتا
مجھے احباب کی تعداد سے توڑا گیا ہے

کبیر اطہر

غزل

مجھ پہ کھولے کہاں اس خاک نے جوہر میرے
میرے ہی گرد نہ گھوما کبھی محور میرے

میں کہ محروم ہوا صحن کی آسائش سے
پھول گملوں میں اُگا کرتے ہیں چھت پر میرے

دل سے ناکام تمناؤں کو جانے نہ دیا
میرے سینے پہ دھرے رہ گئے پتھر میرے

ڈھول کی تھاپ پہ بدمست خوشی کا لمحہ
ناچتا گاتا چلا آتا ہے در پر میرے

کیا مجھے خود میں ڈبونے کا ارادہ ہے ترا؟
مہرباں ہوتا ہے کیوں مجھ پہ سمندر میرے

خود سے باہر مجھے جانے کی ضرورت کیا ہے
میری حیرانی بھرے رکھتی ہے منظر میرے

سب رُتیں میرے ہی اندر سے کہیں پھوٹتی ہیں
کہکشاں میری ہے سارے مہ و اختر میرے

میں نے خود کو بھی نہ تسلیم کیا آج تلک
کتنے احسان ہیں سچ پوچھیے مجھ پر میرے

واجد امیر

غزلیں

بامِ گلرنگ سے اک روز پکارا ہوا میں
دربدر پھرتا ہوں اب عشق کا مارا ہوا میں

کیا کہوں کون سی دنیا کا ہوں رہنے والا
روز و شب ایک اذیت سے گزارا ہوا میں

یہ جو چپ چاپ ترے در پہ چلا آیا ہوں
کسی پندار کی سولی سے اُتارا ہوا میں

کٹ کے رہتا ہوں جو افسردہ خیالوں میں کہیں
اپنے اندر ہی کسی جنگ سے ہارا ہوا میں

شفیق احمد خان

یوں دلِ قریۂ برباد میں کھو جاتا ہوں
شام ہوتے ہی تیری یاد میں کھو جاتا ہوں

دن گزرتا ہے کسی سوچ کے بنجر پن میں
شب کسی درد کی افتاد میں کھو جاتا ہوں

کارِ دنیا سے نکلنا نہیں ممکن ہوتا
تھک کے شہرِ ستم ایجاد میں کھو جاتا ہوں

دیر تک ہجر میں جلتا ہے چراغِ وحشت
میں کسی لمحۂ ناشاد میں کھو جاتا ہوں

اپنے ماضی کی طرف پھر نہ پلٹ کر دیکھا
شہرِ افسوس میں داخل نہ دوبارا ہوا میں

مجھ کو برباد کیا تند مزاجی نے شفیق
کیا کروں اپنے لیے آپ خسارا ہوا میں

یاد آ جاتی ہے رسوائی گزشتہ مجھ کو
ایک بیتی ہوئی روداد میں کھو جاتا ہوں

خواب پنہاں کوئی سونے نہیں دیتا مجھ کو
شب گئے نالہ و فریاد میں کھو جاتا ہوں

بگڑے حالات سنورتے ہیں کہاں مجھ سے شفیق
قصۂ عظمتِ اجداد میں کھو جاتا ہوں

غزل

ہوتے نہیں مرعوب وہ طاقت کے اثر سے
پاتے ہیں جلا جذبِ بغاوت کے اثر سے

ماحول میں نفرت کے بھرو رنگِ محبت
بچنا ہے اگر سب نے عداوت کے اثر سے

پردہ جو پڑا عقل پہ تیری ہے ازل سے
سرطان ہُوا روح کا دولت کے اثر سے

تم دشتِ جنوں میں بھی قدم سوچ کے رکھنا
پاتا ہے نمو عشق صداقت کے اثر سے

جلنا تو غمِ ہجر میں سنتا تھا جسارتؔ
جلتا ہوں شب و روز میں قربت کے اثر سے

جسارت خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر اُس کی کھڑکی روشن کیوں رہتی تھی
کچھ نہ کہا ہم نے بھی ، جان لیا البتہ

غزل

درد کہانی رہنے دے
آنکھ میں پانی رہنے دے

پت جھڑ کل آ جائے گا
آج جوانی رہنے دے

سانس تو آنی جانی ہے
آنی جانی رہنے دے

خوشبو ربط کی ضامن ہے
رات کی رانی رہنے دے

وقت کے بوجھل دریا میں
اک ویرانی رہنے دے

سُونے گھر کے آنگن میں
رُت مستانی رہنے دے

حسرت کی ان بیلوں پہ
درد کا پانی رہنے دے

اپنے میرے بیچ کنولؔ
ایک نشانی رہنے دے

آسناتھ کنول

غزل

خار و خس پہ نہ ایسے ٹال مجھے
میرے پھولوں پہ کر بحال مجھے

جاں کو آنے لگی ہے قیدِ بدن
اس قفس سے ذرا نکال مجھے

اِک عجب سرخوشی سی ہوتی ہے
جب بھی آئے ترا خیال مجھے

دشتِ فرقت میں گھنگھروؤں کے سوا
ڈالنی پڑ گئی دھمال مجھے

مجھ پہ ہونے لگے گمان تیرا
ایسے سانچے میں اب کے ڈھال مجھے

میں نے دیکھا ہے جس طرف انساں
نظر آئے ہیں خال خال مجھے

لڑکھڑانے لگا ہوں میں شیدؔا
گر نہ جاؤں کہیں سنبھال مجھے

جاوید شیدا

غزل

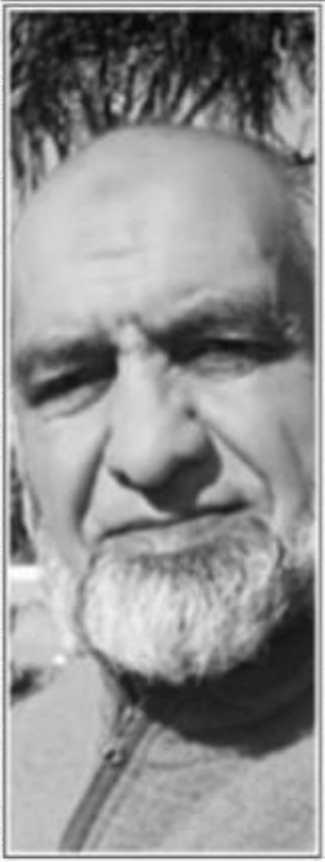

ہجرت جو لوگ گاؤں سے شہروں کو کر گئے
تسبیح کے وہ قیمتی دانے بکھر گئے

پانی ملے لہو میں وہ رنگت نہیں رہی
رشتے خلوص و ناز گھرانوں کے گھر گئے

ہے سرزمین پاک بھی میدانِ کربلا
اپنی گلی میں رکھ کے ہتھیلی پہ سر گئے

جانے امیر شہر سے کیا ہوگئی خطا
بچے ہمارے شہر کے خوابوں میں ڈر گئے

دیوار و در سے لپٹی ہوئی مفلسی ہے آج
میرے وجود کے وہ سبھی بال و پر گئے

رکھتے تھے دل میں درد جو کل سے فقیر کا
وہ لوگ میرے شہر کے جانے کدھر گئے

گل بخشالوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تنہائی سی تنہائی تھی، کرتا بھی تو کیا میں
سو، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

غزل

تیرا جوبن دیکھ کر گھبرا گیا
عکس آئینے سے باہر آگیا

خودکشی کرلی ندی میں کود کر
چاند تیرے حُسن سے گہنا گیا

برف سی کانوں میں جمنے لگ گئی
اس کا لہجہ اس قدر برفا گیا

جھیل کے نزدیک ہی لاشہ مرا
جگنوؤں کے درمیاں رکھا گیا

تیر آخر تیر تھے لگتے رہے
زخم آخر زخم تھا بھرتا گیا

برف کے طوفان میں رکھا مجھے
آگ کی آغوش میں پالا گیا

آسماں پر سب دھنک کے رنگ تھے
کون آنچل بام پر لہرا گیا

روح میں پھر گھنٹیاں بجنے لگیں
پھر کوئی زنجیرِ دل کھنکا گیا

موت کے در پر کوئی دستک ہوئی
زندگی سے پھر کوئی اُکتا گیا

یادِ ماضی کا دریچہ کھول کر
ایک بوڑھے کو جواں رکھا گیا

باغباں کی جب نظر بدلی عقیلؔ
باغ کا ہر پھول ہی مرجھا گیا

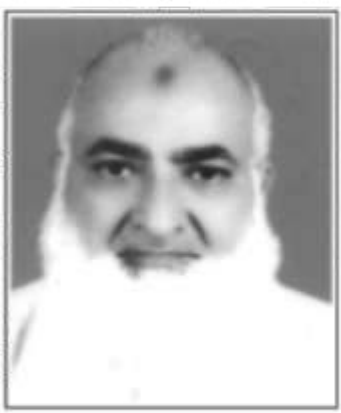

عقیل رحمانی

غزلیں

میری کیا پہچان
میں شاعر نادان
موم نہیں ہوتا
پتھر کا انسان
چڑیوں سے خالی
گھر کا ہے دالان
ختم نہیں ہو گا
جینے کا امکان
آنکھوں میں کل شب
آیا تھا طوفان

لفظوں کے اندر
جیسے ایک جہان
پار لگا مولا
مشکل میں ہے جان
گھر تک جانا ہے
کافی ہے سامان

محمد نوید مرزا

جب حد سے بڑھ گیا ہو اندھیرا زمین کا
تحلیل ہو بھی سکتا ہے چہرہ زمین کا

اب آسماں سے ایک اشارے کی دیر ہے
دیکھے گا کون کون تماشا زمین کا

ہر شخص چاہتا ہے پجاری بہت سے ہوں
اور دیوتا بنے وہ اکیلا زمین کا

مجھ کو بھی روشنی کے سفر سے گزار دے
اے آسمان میں بھی ہوں بیٹا زمین کا

تقسیم ہو گیا ہوں بدن سے میں روح تک
آدھا ہوں آسمان کا آدھا زمین کا

قائم رہے گا سر پہ فلک بھی، یقین ہے
جب تک ہے میرے ساتھ حوالہ زمین کا

کاغذ پہ کھینچتا ہوں لکیریں میں یوں نوید
جیسے بدلنے والا ہوں نقشہ زمین کا

غزل

وفاؤں کی عداوت سے محبت مر بھی سکتی ہے
جفاؤں کی سخاوت سے محبت مر بھی سکتی ہے

نہیں ہے درمیاں جب تک کوئی اچھا ہی اچھا ہے
دلوں میں آئی نفرت سے محبت مر بھی سکتی ہے

اگر 'میں' کو نہ مارا تو ہمیں برباد کر دے گی
اناؤں کی ملامت سے محبت مر بھی سکتی ہے

کسی اِک کی کوئی غلطی ہمیں برباد کر دے گی
کسی کی اِک حماقت سے محبت مر بھی سکتی ہے

اگر دونوں ہی طے کر لیں اکٹھا اَب نہیں رہنا
تو دونوں کی اجازت سے محبت مر بھی سکتی ہے

زبیر فاروق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک لمحہ تھا جسے آخرِ شب تک دیکھا
رات بھر منتظر اپنا ، درِ وا اپنا تھا

غزل

چل کے ہمراہ ہمسفر کر دیں
سفرِ شوق معتبر کر دیں

ہمدمِ جان کو خبر کر دیں
ہم پہ احسان نامہ بر کر دیں

وقت کم ہے گزرنے والے ہیں
اپنی چاہت کی اِک نظر کر دیں

غم کی یہ بے سکوں ہوائیں کہیں
کرکے تنہا نہ دربدر کر دیں

کیا کریں گے اکیلے جی کے ہم
نذرِ آتش یہ اپنا گھر کر دیں

جان دے کر رہِ محبت میں
پیار کو اپنے ہم امر کر دیں

سوچتے ہیں کہ ترک میں شاداؔب
دل ، جگر اس کے نام پر کر دیں

شاداب صدیقی

غزلیں

گر ہو سکے تو لذتِ ہجر و وصال دے
کچھ تو مری نگاہ کے کاسے میں ڈال دے

اس کے سوا تو دل میں کوئی آرزو نہیں
قربت نہیں تو دولتِ خواب و خیال دے

اک بار پھر سے ذات کی تکمیل ہو مری
اک بار پھر سے سلسلۂ ماہ سال دے

ہم کو کسی بھی شے کی ذرا بھی نہیں ہوس
جتنا بھی دے خدا، ہمیں رزقِ حلال دے

آباء کے نام جس طرح روشن ہیں دہر میں
انکی مثال جیسی کوئی تو مثال دے

ایسا نہ ہو ثمینہؔ میں ہو جاؤں لاجواب
ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے فردا پہ ٹال دے

ثمینہ سیّد

گل بھی نہ کھلے، جھولی مری کانٹوں سے بھر دی
موسم نے طبیعت مری مغموم سی کر دی

چہرے نہ جھلستے کبھی سورج کی تپش سے
کیوں دیر سے اس نے ہمیں موسم کی خبر دی

"پتھر ہوں نہیں مجھ پہ اثر" جس نے کہا تھا
دیکھی نہ گئی اس سے مرے چہرے کی زردی

آیا نہ پلٹ کر وہ محبت کے سفر سے
میں نے اسے آواز پہ آواز مگر دی!

کچھ لوگ رہے پھر بھی سیہ رات کے طالب
سورج نے تو ہر شخص کو خیرات سحر دی

کیا بھید ہے اس بات میں، کیوں میرے خدا نے
سب مردہ ضمیروں کو یہاں خلعتِ زر دی

کس طرح ٹھہر جائے بھلا گھر میں ثمینہؔ
تقدیر نے جس شخص کو سوغات سفر دی

غزل

ابھی ہوئے ہی نہیں زخم مندمل دیکھو
رہیم ہونے لگا ہجرِ مستقل دیکھو

لپٹ کے سوئے ہیں صدیوں سے اک خزانے پر
زمیں کو چیر کے سانپوں کا کوئی بِل دیکھو

جو آرزو ہے کہ ویرانیاں دکھائی دیں
تو آ کے دشت مرے گھر سے متصل دیکھو

گرا گرا کے اسے باز تھک چکا ہوں میں
وہ ہو رہا ہے مرے عشق میں مُخل دیکھو

سمجھ سکو گے مرے دل کی وحشتوں کا سبب
تم ایک بار اگر اس کے رُخ کا تِل دیکھو

سُخن میں اس کو اناڑی ابھی سمجھتا ہوں
غزل میں لائے وہ الفاظ مبتذل دیکھو

اسی لیے مرا رُک رُک کے سانس چلتا ہے
پڑی ہوئی ہے تنفس پہ کوئی سِل دیکھو

تمھاری روح بھی تب کانپنے لگے تھر تھر
اگر بدن سے اُترتے یہ آب و گِل دیکھو

بنامِ عشق کہاں دور تک سبھی جائیں
جگر تو دیکھ لیا سب کا، میرا دل دیکھو

حریف بن کے نہ دیکھو کہ آفتاب ہے وہ
پڑا ہوا ہے زمیں پر اُسی کا ظِل دیکھو

تمام شکوے شکایات ختم کر دوں گا
تم ایک دن مرے دفتر میں مجھ سے مل دیکھو

آفتاب خان

غزل

ٹھنڈے جھونکے کی طرح آیا کرو
چھوڑ کر تم مجھے نہ جایا کرو

ہے کڑی دھوپ کا سفر جیون
اپنی زلفوں کا مجھ پہ سایہ کرو

زندہ رکھنا ہے گر ضمیر تمہیں
زندگی سے فریب کھایا کرو

اس سے پہلے کہ زخم بھر جائیں
آکے ان کو کرید جایا کرو

ایک دن بھول جاؤں گا خود کو
اس قدر تم نہ یاد آیا کرو

موت کا کیا ہے آئے گی ایک دن
موت سے خوف تم نہ کھایا کرو

امین کنجاہی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نہ مضطرب ہو، غمِ جاں گزیں! یہ میں تو نہیں
لہو ہیں، سنگ و سرو آستیں، یہ میں تو نہیں

غزل

ہانپتی کانپتی شب کو للکارتی روشنی کی سواری بھی ہے
یہ ہرن یوں ہی بھاگا نہیں پھر رہا اس کے پیچھے شکاری بھی ہے

یار یہ تو بتاؤ مصیبت پڑے تو یہ ہم سب دعا کے لیے
عادتاً ہاتھ اُٹھاتے ہیں یا آسماں سے کوئی رشتہ داری بھی ہے

یہ نہیں ہے کہ جس کا بھی جی چاہے بھاگا پھرے ہر طرف بے سبب
اِن خلاؤں کی وسعت میں سیارچوں کے لیے راہداری بھی ہے

زندگی میں توازن کی سب سے زیادہ ضرورت پڑے گی میاں
قہقہے ہی نہیں ہیں فقط اِس میں گریہ بھی ہے آہ و زاری بھی ہے

تم کو فرصت ملے تو کوئی دن یہاں پر بھی آکر گذارو کبھی
چاند تاروں کی بستی سے تھوڑا پرے ایک کٹیا ہماری بھی ہے

یہ ازل اور ابد سے بھری تھیلیوں کے علاوہ اِدھر دیکھیے
کہنہ زنبیل سے تاکتی جھانکتی خیر و شر کی پٹاری بھی ہے

لوٹ کر جا رہے ہو تو جاؤ مگر جانِ من تم ذرا سوچ لو
عشق کرنا فقط اِک ہماری نہیں یہ ضرورت تمھاری بھی ہے

یہ بساطِ سخن تم نے مرضی سے اپنی سجائی ہوئی ہے یہاں
چال جو بھی چلو تم مگر یاد رکھنا کہ پھر میری باری بھی ہے

ریاض رومانی

غزل

نعیم رضا بھٹی

اس لیے لب پہ ہیں سوال نئے
چاہتا ہوں میں خد و خال نئے

پھینکتا کون ہے مری جانب
بے یقیں کشتیوں سے جال نئے

یوں نہیں چپ رہے ہیں ہم برسوں
خامشی دیتی ہے مآل نئے

قید ہیں آنکھ میں جو نظارے
ان سے ہی پائے ہیں خیال نئے

ہار اور جیت تو مقدر ہے
یار اب مورچے سنبھال نئے

بے رخی کے لیے نعیم رضاؔ
لیجئے حزن اور ملال نئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الزام لگائیں گے ، یاروں پہ وہ کیا خالد
یاروں کے سوا خالد ، دشمن ہمیں کیا دیں گے

غزل

آگ یوں اس کی محبت نے لگائی مجھ میں
اب تو ممکن نہیں خود کو بھی رسائی مجھ میں

دیکھ سکتا ہوں میں دیوار کے آگے پیچھے
اس نے بینائی کی وہ شمع جلائی مجھ میں

تیری آواز جو سنتا ہوں تو سر دھنتا ہوں
ہجر کرتا ہے بہت نغمہ سرائی مجھ میں

پھیر لیتا ہے مجھے دیکھ کے آنکھیں اپنی
جانے کیا بات اسے اب نظر آئی مجھ میں

مجھ کو اب اور دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی
اس نے آکر کوئی دیوار اٹھائی مجھ میں

میرے احباب کی حد درجہ عنایت ہے کمالؔ
ڈھونڈ لیتے ہیں نئی روز برائی مجھ میں

اشرف کمال

غزلیں

چل سکتا تھا جتنا وہ مرے ساتھ چلا خیر
غم یہ ہے کہ اک مان تھا جو ٹوٹ گیا، خیر

میں جھیل گیا جو بھی ہوا جیسے ہوا خیر
لیکن ہے ترے واسطے بس دل سے دعا خیر

لوگوں نے ترے بارے میں کیا کیا نہ بتایا
اندر سے تو میں کٹ سا گیا پھر بھی کہا خیر

اک عمر لگی تب یہ کہیں مجھ پہ کھلا راز
مانگو جو اگر خیر تو کرتا ہے خدا خیر

وعدے کا تو کیا بھول ہی جاتے ہیں سبھی لوگ
لیکن وہ مرا نام تلک بھول گیا، خیر

صغیر احمد صغیر

مجھے اکثر لگا بھی اور نہیں بھی
میں اس کے دل میں تھا بھی اور نہیں بھی
مقدر پر ہنسی آنے لگی تھی
وہ مل کر جب ملا بھی اور نہیں بھی
نظر اس نے اٹھائی اور جھکا لی
کہ جیسے کچھ کہا بھی اور نہیں بھی
عجب سا واقعہ تھا سوچتا ہوں
جو لگتا ہے ہوا بھی اور نہیں بھی
میں اس سے مل کے اتنا خوش ہوا تھا
میں اس کے پاس تھا بھی اور نہیں بھی
اگر پوچھا کسی نے، کیسی گزری؟
تو کہہ دوں گا جیا بھی اور نہیں بھی

مرے بچے جواں ہونے لگے تھے
مَیں اپنے گھر میں تھا بھی اور نہیں بھی
وہ رد و کد بہت اچھا لگا تھا
کسی کا روکنا بھی اور نہیں بھی
اشارے اور کنائے درمیاں تھے
وہ ہم پر کچھ کھلا بھی اور نہیں بھی
صغیرؔ اس واہمے میں عمر گزری
وہ میرے ساتھ تھا بھی اور نہیں بھی

غزل

چڑھتا سورج کہ ڈھل بھی جاتا ہے
اور انساں بدل بھی جاتا ہے

گمرہی ہو تو اپنے ہاتھوں سے
کوئی رستہ نکل بھی جاتا ہے

جب بھلائی کا سوچتا ہے کوئی
اُس میں پڑ کچھ خلل بھی جاتا ہے

گر جو رد بلا کا آسرا ہو
خطرہ جو ہو وہ ٹل بھی جاتا ہے

جو سیانوں کی بات مانتا ہے
لگے ٹھوکر سنبھل بھی جاتا ہے

سامنے مشکلیں ہوں جب تاثیر
اُن کا کچھ حل نکل بھی جاتا ہے

تاثیر نقوی

غزلیں

گلاب رنگ سے غنچوں میں لوٹ آئے ہیں
پرندے پھر سے بہاروں میں لوٹ آئے ہیں

جو شام ڈھلتے ہی سورج کے ساتھ ڈوب گئے
سحر کے نور سویروں میں لوٹ آئے ہیں

ہوئی جو پہلی ہی بارش تو رنگ بچپن کے
نکل کے دیکھیے گلیوں میں لوٹ آئے ہیں

وہ میرے خواب جو جھلسا دیے تمازت نے
شبِ سیاہ کے تاروں میں لوٹ آئے ہیں

غلاف دل میں جو خوابیدہ ہی رہے برسوں
وہ ولولے میری آنکھوں میں لوٹ آئے ہیں

خبر یہ آج کے اخبار میں نہ لگ جائے
وہ میرے خواب دریچوں میں لوٹ آئے ہیں

رضاؔ جو قلب و نظر کا کبھی اثاثہ تھے
وہ درد لوگوں کے لہجوں میں لوٹ آئے ہیں

رضا اللہ حیدر

کیسے اٹھا لوں سامنے گر کر پڑا ہوا
رہ میں مری انا کا ہے پتھر پڑا ہوا

داغِ مفارقت مجھے آخر کو دے گیا
مدت سے تھا علیل برابر پڑا ہوا

کیا جانے پربتوں کا مسافر کدھر گیا
اک پر تھا اک چٹان کے اوپر پڑا ہوا

کھیے کے انجذاب کی کوشش تھی رائگاں
گوشے میں دل کے تھا کہیں منظر پڑا ہوا

جاتے ہوئے بھی کر نہ سکا آخری سلام
ایسا گلے میں تھا مرے دفتر پڑا ہوا

اُس نے تو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا
آنکھوں میں تھا غرور کا کنکر پڑا ہوا

دیکھا ہے جاتے جاتے رضاؔ باد تند نے
تتلی کا پنکھ ٹوٹ کے چھت پر پڑا ہوا

غزل

جستجو کر کون سا اسرار روپوشی میں ہے
گفتنی ناگفتنی سب کچھ تو خاموشی میں ہے

بسکہ معراجِ سخن حرفِ خطا پوشی میں ہے
تم بھلے سمجھو کہ یہ چپ مصلحت کوشی میں ہے

تو محبت کرنے والوں کا گلے ملنا تو دیکھ
ہجر کا ہر رنگ ہی جیسے ہم آغوشی میں ہے

ہاں گزارے ہیں کئی لمحے تمنا کے بغیر
وائے رے خوشی ترا ہونا بلا نوشی میں ہے

کچھ سمجھ آتا نہیں کیا کیا کہے جاتا ہوں میں
کیا بتاؤں خود کلامی تک تو سرگوشی میں ہے

ہیں سدا کے عیش و عشرت دو بہ دو ناسازگار
حظ اٹھانا چاہتے ہیں ہم جو مدہوشی میں ہے

کون اٹھائے گا تری حالت کی ذمہ داریاں
اور دھر الزام ابھی ہمت ترے دوشی میں ہے

آپ اپنی روشنی کا عکس دے تو راز اسے
یہ سحر تو جانے کب سے خود فراموشی میں ہے

حسنین سحر

غزل

کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں کوئی مثال کہ بس
وہ ایسے کرتا رہا میری دیکھ بھال کہ بس

مَیں ہوش میں تھا مگر ہوش ہی نہیں تھا مجھے
بچھڑتی کونج کا ہوتا ہے جیسے حال کہ بس

ہر اک خوشی مری جھولی میں آ گری ترے بعد
مگر عروج بھی لگنے لگا زوال کہ بس

کبھی تو تیری طرف دھیان ہی نہیں جاتا
کبھی کبھی ترا آنا ہے یوں خیال کہ بس

گلاب کھلتا ہوا اور دن نکلتا ہوا
تمہارے حُسن کی اب کیا مَیں دوں مثال کہ بس

ہر اک طرف سے برستے رہے ہیں پتھر نہ پوچھ
ظہورؔ لوگوں نے اتنے کئے سوال کہ بس

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج اُبھرے تو زمیں پر سے اُٹھائے سائے
روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

غزلیں

آئنے میں بھی نقص کوئی نہیں
پھر بھی منظر میں عکس کوئی نہیں

سارا جنگل ہوا سے خالی ہے
خشک پتوں کا رقص کوئی نہیں

شہر ویسا ہی بھیڑ میں گم ہے
ہاں مگر ایک شخص کوئی نہیں

اُس نے پیڑوں پہ ڈال دی مٹی
ورنہ موسم میں حبس کوئی نہیں

ایسے دریا کا کیا کروں گوہرؔ
جس کی موجوں میں رقص کوئی نہیں

افضل گوہر

شورشِ دل میں جو اظہار وفا ممکن ہے
اس کا مطلب ہے اندھیرے میں ضیا ممکن ہے

غور سے دیکھ مرے یار تُو لوحِ دل کو
میں نے لکھا ہو کہیں نام ترا، ممکن ہے

تجھ کو معلوم نہیں کیا اے مسیحا میرے
اک محبت سے فقط دل کی دوا ممکن ہے

تجھ سا مہمان ہی جب گھر میں نہیں آیا مرے
پھول گلدان میں تازہ رہے کیا ممکن ہے

مدتوں بعد مہک جائے یہ اجڑا گلشن
تیرے آجانے سے اے بادِ صبا ممکن ہے

لوٹ کر جاؤں کبھی اُس کی گلی میں ارشدؔ
منتظر ہوگا ابھی یار مرا ممکن ہے

ارشد سعید

غزلیں

ہر کسی کو ہے اپنی ذات کا دکھ
کون سمجھے گا کائنات کا دکھ

تم نے صحرا میں آنکھ کھولی ہے
تم کہاں جانو خشک پات کا دکھ

آؤ اب دن کو یادگار کریں
کچھ تو کم ہو گذشتہ رات کا دکھ

کتنے گہرے ہیں گھاؤ لہجوں کے
کتنا گہرا ہے تیکھی بات کا دکھ

میں نے خود سے شکست کھائی ہے
اب کروں بھی تو کیسے مات کا دکھ

خانۂ دل کو لوگ ڈھاتے ہیں
آپ کرتے ہیں سومنات کا ڈکھ

ہم رہ زیست کے مسافر ہیں
جن کو ارشدؔ ہے التفات کا دکھ

ارشد محمود ارشد

اپنے ہاتھوں سے خود بنائی چائے
رات اُس نے مجھے پلائی چائے

لمس شامل تھا چسکیوں میں کوئی
میں نے ہونٹوں سے جب لگائی چائے

یہ صلہ ہے مری ریاضت کا
بارہ برسوں کی ہے کمائی چائے

ذائقہ اس لیے ہوا دوچند
تھوڑی چاہت تھی ، کچھ ملائی چائے

طشت میں جام بھی دھرے ہوئے تھے
یار میں نے فقط اُٹھائی چائے

آؤ یہ ساتھ ہی مرا گھر ہے
میں پلاتا ہوں تجھ کو بھائی چائے

آپ جانے لگے کہاں ارشدؔ
بیٹھیے ، بیٹھیے کہ آئی چائے

غزل

مسکرا کر زخم سہنے کی سزا بنتی تو ہے
بزمِ دل میں درد کی تھوڑی جگہ بنتی تو ہے

مبتلائے شوق کو اس چشمِ خم سے ہے شفا
اس دوا خانے میں اکسیری دوا بنتی تو ہے

لَو دیے کی ڈٹ گئی ہے آندھیوں کے سامنے
اِس ادا پر وارنے کو اب ہوا بنتی تو ہے

پھر پلٹ آئی ہیں دیکھو سردیاں لاہور میں
گرم کافی کے لئے اک التجا بنتی تو ہے

سرد موسم زخمِ دل کے پھر ہرے کر جائے گا
شب دسمبر کی نمی کا سلسلہ بنتی تو ہے

کچھ معانی سو رہے ہیں خامشی کو اوڑھ کر
سرد مہری بڑھ گئی ہو تو قبا بنتی تو ہے

ایک دن ہو جائیں گی یہ آندھیاں بھی فرشِ راہ
خاک جتنی بھی اڑے وہ راستہ بنتی تو ہے

عاطف جاوید عاطف

غزل

ہو گیا ہے گھر مرا مسمار میرے سامنے
گر گئے ہیں سب در و دیوار میرے سامنے

پوچھنے والا نہیں کوئی ثقافت کو یہاں
ہو گئے خوار و زبوں فنکار میرے سامنے

کوئی تو ان کا مداوا کر خدا کے واسطے
مر رہے ہیں اب ترے بیمار میرے سامنے

میں اسے حیران ہو کر دیکھتا ہی رہ گیا
کر گیا وہ پیار کا اظہار میرے سامنے

دوستو یہ تو سراسر ہے پلندہ جھوٹ کا
رکھ رہے ہیں آپ جو اخبار میرے سامنے

ایک دم اس نے بھلا ڈالا سری خدمات کو
کر گیا تھا وہ مرا انکار میرے سامنے

یہ گلاب و یاسمن کی پتیاں ہیں دوستو
یا کسی کے ہیں لب و رخسار میرے سامنے

میں اسی پر عمر بھر چلتا گیا چلتا گیا
راستہ تھا ایک ناہموار میرے سامنے

دے رہا تھا داد اسے میں بھی زمانے کی طرح
پڑھ رہا تھا وہ مرے اشعار میرے سامنے

مارنے کو آ گئے تھے میرے اپنے ہی مجھے
ٹھہر سکتے تھے کہاں اغیار میرے سامنے

دشمنوں سے ہو گئی جس وقت میری دوستی
آ گئے اس وقت رشتہ دار میرے سامنے

جا رہا ہوں یار میں بھی قتل ہونے کے لیے
مر گئے انصر مرے انصار میرے سامنے

انصر حسن

غزل

دِکھائی دے رہے ہیں اِس لیے کچھ شہہ فقیری میں
مزے آتے نہیں ہیں آج کل شاید وزیری میں

بہت اونچے یہاں پر نام تھے جن کے امیری میں
اُنہیں شہزاد پرکھیں گے کسی دن دستگیری میں

مزے دانوں کے جب سے چکھ لیے صیاد کے ہاتھوں
فضاؤں کے پرندے آج کل خوش ہیں اسیری میں

گلوں کو چھوڑ کر شاخوں پہ تنہا خار کیوں اُگتے
محبت کا اگر پانی دیا جاتا نیچری میں

کبھی جو گیت گائے تھے کئی دن پیار کے مل کر
وہ نغمے ڈھل چکے ہیں آج کل غم کی نفیری میں

رسائی دے ہی دیتے ہیں دلوں تک اشک ہی آخر
ازل سے نام ہے اونچا یہاں اُن کا سفیری میں

وہ سارے لوگ جو کل تک بہت ہی فتنہ پرور تھے
بُجھے رہتے ہیں اُن کے آج کل سرحل پذیری میں

عقابوں کے شکاری تھے اُنہیں کیا ہو گیا آخر
وہ اپنے شوق کیوں رکھتے ہیں چڑیا میں ٹیٹری میں

شہزاد احمد شیخ

غزلیں

شکستہ حال کی بن جائے آس تازہ برس
گذشتہ رت کا نہ ہو التباس تازہ برس

بنا خلل کے چلیں زندگی کے معمولات
فضا پہ چھائے نہ خوف و ہراس تازہ برس

کوئی جوان بھی بد دل نہ روزگار سے ہو
نہ مامتا ہو کسی کی اداس تازہ برس

کسک، اداسیاں، رنج و ملال جاتے ہیں
دکھی دلوں کو بھی آ جائے راس تازہ برس

یہاں نہ حق سے ہو محروم کوئی بھی حقدار
بروئے کار ہوں جوہر شناس تازہ برس

مریں نہ بھوک سے تھر کے غریب باشندے
رہے نہ بچہ کوئی بے لباس تازہ برس

گھٹائی جائے تفاوت رئیس و مفلس میں
بنائیں عدل کو جاذبؔ اساس تازہ برس

اکرم جاذب

ستارا حسن کا جب بام پر نظر آیا
غروبِ مہر نگاہوں میں سر بسر آیا

یہ نخلِ فن ہے اسے سینچنا پڑا برسوں
لگی ہے عمر تو اس پیڑ پر ثمر آیا

کنویں پہ جائے گا پیاسا ہی کون کہتا ہے
مرے قریب تو خود سایۂ شجر آیا

نہیں نہیں یہ ملاوٹ مجھے نہیں کرنی
ترے علاوہ خیالوں میں کون در آیا

اگر غروب ہوا شام آس کا سورج
سحر کے وقت نیا ایک پھر ابھر آیا

جو ہنس رہا ہے مجھے سوگوار دیکھتے ہی
یہ دل پرائے غموں پر ہمیشہ بھر آیا

رواں دواں ہی رہے کب بھلا رکے جاذبؔ
سفر تمام ہوا ، پیش پھر سفر آیا

غزلیں

سب کھلونوں کی طلب سے ماورا ہو جائے گا
کب تلک بچہ رہے گا دل بڑا ہو جائے گا

اس طرح اصرار سے تم پوچھتے ہو خواہشیں
جوں طلسمی شہر ہے یہ جو کہا ہو جائے گا

دل کے کولک میں ہنسی کی ریزگاری ڈال کر
تب نکالوں گا میں جب اک قہقہہ ہو جائے گا

دھوپ کس کے جسم پر کیا جائیے کیسے لگے
سوکھ جائے گا کوئی، کوئی ہرا ہو جائے گا

بیٹھ جانے کا کہاں کہتے اگر تم جانتے
مسئلہ جو بیٹھ جانے سے کھڑا ہو جائے گا

عزم الحسنین عزمی

بھنور میں تُو ہی فقط میرا آسرا تو نہیں
تُو ناخدا ہی سہی پر مرا خدا تو نہیں

اک اور مجھ کو مری طرز کا ملا ہے یہاں
سو اب یہ سوچتا ہوں میں وہ دوسرا تو نہیں

یہ اب بھی چلتا ہے سایہ جو ساتھ ساتھ مرے
بتا اے وقت کبھی میں شجر رہا تو نہیں

ہیں گہری جڑ سے شجر کی بلندیاں مشروط
سو پستیاں یہ کہیں میرا ارتقا تو نہیں

جو پاس یہ مرے بے خوف چل کے آتے ہیں
مرے بدن پہ پرندوں کا گھونسلا تو نہیں

اے آئنے تُو ذرا دیکھ غور سے مری آنکھ
گرے ہیں اشک کوئی خواب بھی گرا تو نہیں

غزلیں

یہ رنج پہلے کا ہے یہ ملال پہلے کا ہے
فراقِ یار میں افسردہ حال پہلے کا ہے

نئے برس میں نیا لگ رہا ہے لوگوں کو
یہ ویسے دوست مرا ایک سال پہلے کا ہے

ہم ایک دوجے سے اب تو نہیں ملے ہیں کوئی
یہ رابطہ تو ہمارا بحال پہلے کا ہے

جسے بھی چاہا اُسے پا لیا محبت سے
ہماری ذات میں یہ بھی کمال پہلے کا ہے

گزر گیا ہے جو آنکھوں کے سامنے سے اسدؔ
یہ دوستی میں خفا خوش جمال پہلے کا ہے

اسد اعوان

بکھرا تو نہیں ہجر میں شیرازہ غزل کا
کھلتا ہے مرے واسطے دروازہ غزل کا

جب اُس نے سرِ بزم یہ آنکھوں سے سنائی
تب ہم کو ہوا ٹھیک سے اندازہ غزل کا

یہ شعر بھی اترا ہے تری گلیوں میں ہم پر
یہ شعر بھی مشہور ہوا تازہ غزل کا

ہر موڑ پہ رسوائی ہوئی شہرِ ہوس میں
بھگتا ہے جوانی میں یہ خمیازہ غزل کا

جو شاعرِ فطرت سے گریزاں ہے اُسی کے
رخساروں پہ دیکھا ہے مگر غازہ غزل کا

بیکار شکایت ہے زمانے سے اسدؔ کو
اب کون سُنے شور میں آوازہ غزل کا

غزلیں

نیند کا سارا عمل خواب گزرنے تک تھا
اس سے رشتہ تو تعلق سے مکرنے تک تھا

ایک دم ٹوٹ گیا سارا طلسمی منظر
آئینہ خانہ فقط تیرے سنورنے تک تھا

کوئی مصنوعی تنفس سے کہاں تک جیتا
سانس کا سلسلہ انسان کے مرنے تک تھا

کس لئے تم نے سجایا اسے گلدانوں میں
پھول کا حسن تو خوشبو کے بکھرنے تک تھا

زور ایسا تھا کہ لہروں سے بہا دے بستی
یہ رویہ بھی تو دریا کا اترنے تک تھا

آبشاروں میں بھی ملتا نہیں احسانؔ مجھے
میں نے ڈھونڈا تو اسے آخری جھرنے تک تھا

احسان گھمن

تم جو ہوتے ہو تو لگتا ہے جہاں میرا ہے
ورنہ اے دوست یہاں کچھ بھی کہاں میرا ہے

بھاگتا جاتا ہوں اس واسطے دریا کی طرف
پیاس کہتی ہے کہ یہ آبِ رواں میرا ہے

دل سلگنے کا پتہ اور بھلا کیا دوں میں
یہ کوئی ابر نہیں سارا دھواں میرا ہے

میں تو اس واسطے بھی کھل کے نہیں رو سکتا
میرے سینے میں کوئی رازِ نہاں میرا ہے

خواب میں کیا ہے کسی کو میں دکھاؤں کیسے
جو بھی منظر ہے وہ سب وہم و گماں میرا ہے

اس لیے سوئے فلک دیکھتا رہتا ہوں میں
اک ستارہ تو سرِ کاہکشاں میرا ہے

یاد کرتا ہوں جو دن رات وطن کو گوہرؔ
میرے پیارے ہیں جہاں کچھ تو وہاں میرا ہے

امتیاز علی گوہر

غزل

کیا عجب ہے اب وہ مجھ سے پیار بھی کرنے لگے
اور اک اک بات پر تکرار بھی کرنے لگے

پہلے میری راہ کو دیتے رہے وہ پیچ و خم
ہوگیا جب پیار تو ہموار بھی کرنے لگے

کیا ستم ہے نیند کی ایجاد تھے جو وہ ہی خواب
مجھ کو گہری نیند سے بیدار بھی کرنے لگے

دوسروں کو کامیابی کی خوشی دینے کے سکھ
اب عطا مجھ کو غم و آزار بھی کرنے لگے

دل میں ہی جو عشق کا کرتے تھے پہلے انحراف
اب وہ گستاخی سرِ بازار بھی کرنے لگے

ان کو احساس شباب آخر ذکی ہو ہی گیا
ناز بھی کرنے لگے سنگار بھی کرنے لگے

ذکی طارق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رنگ میں رنگیں کہ یہ لب پھول بن سکیں
کس طور کس طریق تری گفتگو کریں

غزلیں

جہانِ گل ہے میاں، قریۂ سراب نہیں
یہ دل جلوں کی گلی ہے یہ کنجِ خواب نہیں

دُعا سلام بھی دُنیا سے منقطع کر لیں
خراب ہے یہ مگر اتنی بھی خراب نہیں

کسی بھی لفظ سے آئے قرار جاں کی مہک
کتابِ زیست میں ایسا کوئی بھی باب نہیں

میں ایک ایسے خرابے میں رہ رہا ہوں جہاں
کوئی ستارہ نہیں، کوئی ماہتاب نہیں

تمہاری بات پہ اِک بار پھر یقیں کر لوں
ہزار سادہ سہی، اتنا بھی جناب نہیں

فریب کھائے ہیں ہم نے ہزار لیکن
منافقت کا تمہاری مگر جواب نہیں

کچھ ایسے پاؤں جمائے ہیں تیرگی نے یہاں
کسی بھی بام تمنا پہ آفتاب نہیں

وسیم عباس

اس میں کچھ خیر کا عمل تو نہیں
یہ غزل آج کی غزل تو نہیں

اِس کا پھیلاؤ ہے زمانوں پر
زندگی صرف ایک پل تو نہیں

بات کرنے میں کیا برائی ہے
خودکشی مسئلے کا حل تو نہیں

یہ جو بکھراؤ سا ہے سوچوں میں
اب دماغوں میں کچھ خلل تو نہیں

آ رہی ہے فلک سے کیسی ندا
یہ کوئی لمحۂ اجل تو نہیں

اُڑ رہا ہے یہ کیسا گرد و غبار
یہ گلستاں ہے کوئی تھل تو نہیں

مدتوں تیرا انتظار کیا
اتنی جلدی میں چاند، ڈھل تو نہیں

ختم نہ جائے بہاؤ دھڑکن کا
اتنی شدت سے دل مچل تو نہیں

نظر انداز یوں نہ کر اِن کو
میرے آنسو ہیں کوئی جل تو نہیں

غزلیں

بُوالہوس سی نظر نہ ہونے دی
ہو ہی جاتی مگر نہ ہونے دی

دل ہی دل میں کسی کو چاہا ہے
اور اُس کو خبر نہ ہونے دی

اپنے من میں ہی رو لیا اکثر
کرب میں آنکھ تر نہ ہونے دی

دردِ دل مسئلہ رہا دل کا
عاشقی دردِ سر نہ ہونے دی

عمر بھر دُکھ کا بوجھ ڈھویا ہے
پر خمیدہ کمر نہ ہونے دی

ایک در پر ہی میں پڑا ہوں امرؔ
زندگی در بدر نہ ہونے دی

امر مہکی

کچھ نہیں لُطف ، جور کچھ بھی نہیں
اِک تعلّق ہے اور کچھ بھی نہیں

یوں ہی مِل بیٹھنے کا کیا کہنا
کہنے کو زیرِ غور کچھ بھی نہیں

دل کا سناٹا چیختا ہے مگر
دھڑکنیں سُن تو شور کچھ بھی نہیں

دل کا رشتہ ہے کچے دھاگے کا
کوئی توڑے تو ڈور کچھ بھی نہیں

جو نہیں مانتا نہ مانے امرؔ
کہ منانے پہ زور کچھ بھی نہیں

غزل

کھو گیا تھا میں کہانی کار سے
بچ گیا ہوں کیفِ کردار سے

روشنی، خوشبو، صدا کی آس تھی
سانپ آئے روزنِ دیوار سے

پی لیا غصہ عقیدت سے کبھی
کھا لیا دھوکہ کبھی دستار سے

بے خبر تھا شہر تو پرامن تھا
خوف پھیلا ہے یہاں اخبار سے

جس کے پیچھے آ گئے اس پار ہم
آ رہی ہے وہ صدا اُس پار سے

دل اگر ٹوٹا ہوا ہے، شعر کہہ
کام لے اس حاشیہ بردار سے

جس طرح سرکا رہے ہو تم زمیں
آ لگے گا آسماں دیوار سے

اپنے اندر کون جھانکے گا یہاں
آدمی روٹھا ہوا ہے غار سے

آ گیا ہے سیڑھیوں تک آسماں
اس نے کپڑے کیا اتارے تار سے

بے گناہی ساتھ اُترے گی مرے
جب اُتارا جاؤں گا میں دار سے

عام سا روزہ تھا راجا ہجر بھی
آٹھ پہرا ہو گیا افطار سے

محمد اویس راجا

غزلیں

موسموں سے کہہ دینا اب کے جب بھی آؤں گا
پیڑ اور پرندوں کے گیت میں سناؤں گا

جب تلک مری منزل مجھ کو مل نہیں جاتی
بار بار میں تیرے راستے میں آؤں گا

کاش اب تو خاموشی بات کرنے لگ جائے
میں تجھے اکیلے میں کیسے گنگناؤں گا

اُس نے جب اُڑانوں کے گُر مجھے سکھائے ہیں
میں تو پھر خلاؤں کے آر پار جاؤں گا

منجمد خیالوں کی دُھند اتنی گہری ہے
آنکھ سے پرے کیا ہے کیسے دیکھ پاؤں گا

امجد معراج

مرا مرے سوا کوئی جہان میں نہیں رہا
میں تیر ہوں چلا ہوا کمان میں نہیں رہا

کسی کو زر زمیں ملی کسی کو گھر ہوا نصیب
میں منجھلا تھا اس لیے بھی دھیان میں نہیں رہا

بُرا نہیں بھلا ہوا کہانی ختم ہو گئی
مرا کوئی بھی رول داستان میں نہیں رہا

مرا خیال اور تھا مری اُڑان اور تھی
کچھ اس لیے بھی اب میں خاندان میں نہیں رہا

مری یہ تجھ سے دوستی یا دشمنی فضول ہے
کہ اب تُو میرے وہم اور گمان میں نہیں رہا

ساجد محمود رانا

غزلیں

یہ باتیں صرف دل کا نوری تم کو بتاتا ہے
شجر پچھلے پہر میں حمد رب کی جب سناتا ہے

کسی دن قدر پوچھو اس تھکے مزدور سے گھر کی
جو سونے کے لیے فٹ پاتھ پر بستر بچھاتا ہے

محبت کے علاوہ ہیں مسائل اور بھی اس کے
وہ اس گھر میں اکیلا شخص ہی روزی کماتا ہے

بزرگوں کی کئی یادیں بھی بنیادوں سے ملتی ہیں
بہت روتا ہے جب کوئی پرانے گھر کو ڈھاتا ہے

مجھے مت روک میرا اس قبیلے سے تعلق ہے
جو جاں تو وار دیتا ہے مگر عزت بچاتا ہے

وہ مر جاتا ہے لیکن چھوڑ کر گنبد نہیں جاتا
کبوتر اس طرح دربار سے نسبت نبھاتا ہے

ہمیشہ ساتھ رہتی ہے کسی کی ماں نہیں مرتی
مرے وہم و گماں کا تجربہ مجھ کو بتاتا ہے

وجاہت تبسم

آنکھوں کے ساتھ دل بھی بڑا بے قرار ہے
زندہ ہوں اس لیے کہ ترا انتظار ہے

رنگینیاں جہاں کی میسر کہاں مجھے
وحشت زدہ غموں پہ مرا انحصار ہے

کیسے تو کہہ رہا ہے میں تابع نہیں ترا
تجھ پر تو میری جان یہ جاں بھی نثار ہے

بھولا نہیں ہوں پہلی ملاقات اس لیے
پر لطف زندگی ہے ابھی تک خمار ہے

صحنِ چمن میں جیسے قدم آپ کے پڑے
پت جھڑ میں لگ رہا تھا یہ صبح بہار ہے

دن کو تُو رات کہہ یا کہے رات کو تُو دن
تیرے تو جھوٹ پر بھی ہمیں اعتبار ہے

اسد رضا سحر

غزلیں

مجھے تھا جانا بہت دور اِس زمانے سے
جدا ہوئی ہوں میں اُس سے کسی بہانے سے

پلٹ کے آئی ہے ناکام ہر صدا میری
کسی نے ہاتھ نہ کھینچا مجھے ستانے سے

وہ کیسے پاتے نمو اس شجر کے سائے میں
جُدا خیال تھے میرے سبھی زمانے سے

یہ اُن سے ترکِ تعلق کی بات رہنے دو
چراغ عشق بجھا ہے کبھی بجھانے سے!

مرا قصور تھا خود کو نہ آزما پائی
سنا ہے منزلیں ملتی ہیں آزمانے سے

جہاں ہو دل میں محبت تو رُوٹھنا کیسا
وہ مان جاتے ہیں پہلے مرے منانے سے

دو ڈھائی گز کی تصوّر میں ملکیت لے کر
امیر خود کو سمجھتی ہوں میں زمانے سے

نہ کھلتیں آنکھیں کبھی فوزیہ زمانے کی
حقیقتیں جو نہ کھلتیں مرے فسانے سے

فوزیہ مغل

لمحہ لمحہ جو یہ خود کو مٹا رہی ہو تم
بھلا سکو گی نہ جس کو بھلا رہی ہو تم

تمہارے دل میں یہ کس کا خیال رہتا ہے
وہ بات کیا ہے جو سب سے چھپا رہی ہو تم

سلگ رہی ہو خموشی کی آگ میں تنہا
یہ کیسا عہد ہے جس کو نبھا رہی ہو تم

یہ زرد چہرہ یہ آنکھیں کہاں چھپاؤ گی
جو راتیں ہجر کی تنہا بتا رہی ہو تم

منا بھی لوگی تو آخر وہ رُوٹھ جائیں گے
ادائے خاص سے جن کو منا رہی ہو تم

زمانہ فوزیہ تم پر ترس نہ کھائے گا
کیوں اپنے درد کا قصہ سنا رہی ہو تم

غزل

آفریں اضطرابِ پیہم کو
وہ بھی تڑپے ہیں دیکھ کر ہم کو

آگ لگ جائے سعیِ پیہم کو
راس آئی نہ آج تک ہم کو

دور ہی کی مناسبت ہوتی
وسعتِ دل سے وسعتِ غم کو

یہ ہمارا وطن نہیں کہ یہاں
کوئی پہچانتا نہیں ہم کو

جب مرتب ہو ذکرِ اہلِ جنوں
سرِ فہرست دیکھنا ہم کو

کب سے دونوں طرف ہے خاموشی
کون توڑے سکوتِ باہم کو

پرسشِ حالِ دل نہیں نہ سہی
مسکرا کر ہی دیکھ لو ہم کو

جب بھی کوئی وفا کا دعویٰ کرے
پیش کرنا مثال میں ہم کو

ہم نے پھر بھی اُسے دعائیں دیں
دکھ دیے جس نے عمر بھر ہم کو

میرے آنسو ہیں گوہرِ نایاب
جھوٹے موتی ملے ہیں شبنم کو

کس سلیقے سے روکے رکھتے ہیں
اپنے دل پر تلاطمِ غم کو

رومانہ رومی

غزل

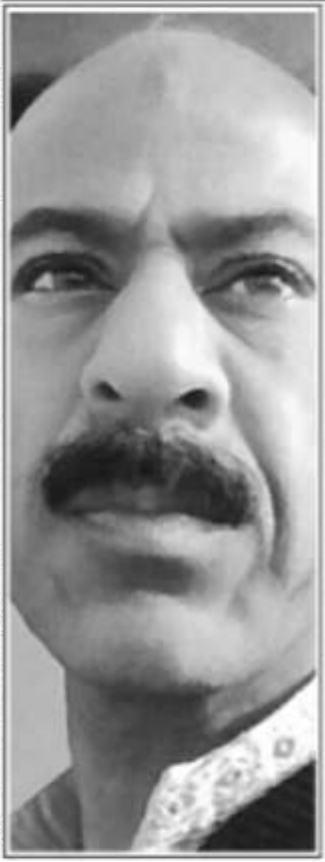

نبیل قیصر

کاش کچھ اہتمام ہو جاتا
مجھ سے وہ ہمکلام ہو جاتا

نیکیوں پہ بہار آ جاتی
نفس گر زیرِ دام ہو جاتا

گر وہ دعوت قبول کر لیتے
اس کا پھر شہرہ عام ہو جاتا

تھوڑا سا التفات گر کرتا
میں اُسی کا غلام ہو جاتا

میں تو آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا
وہ بھی محوِ خرام ہو جاتا

اس کی نیت نہیں تھی صاف نبیلؔ
ورنہ میرا بھی کام ہو جاتا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے احتیاج یہ نمِ غم تاب اور ہے
سلکِ مژہ میں اک درِ ناب اور ہے

غزلیں

جس کو دیکھنا ممکن تھا بس خوابوں میں
اک دن لفظ پہن کر آیا غزلوں میں

مجھ میں گونج رہا ہے کیسا سناٹا
کیسا جھلمل شور ہے اُس کی آنکھوں میں

ویرانی بھی حیرانی سے تکتی ہے
کیسا منظر بکھر گیا ہے گلیوں میں

اپنے سر پر سورج باندھ کے پھرتا ہوں
میرا سایہ ہے اب میرے قدموں میں

تاریکی اور ایسی اندھی تاریکی
سورج ہی اب رکھنا ہوگا طاقوں میں

تنہائی کا خوف اور ایسا خوف کہ میں
اپنے آپ کو چھوڑ آیا ہوں لوگوں میں

جب لکھتا ہوں الف سے ے تک لکھتا ہوں
وہ رہتا ہے یہیں کہیں اِن حرفوں میں

عدنان نبیل

بنایا تھا مجھے گر آئینہ تو
پھر اپنا عکس مجھ میں دیکھتا تو

چلو اک ضابطہ مل کر بنا لیں
ہمارے بیچ پھر جھگڑا ہوا تو

بس اتنا سوچ کر روتے رہے ہیں
بچھڑ کر جو نہیں رویا گیا، تو؟

ہو دل میں مختلف اور لَو لگا لے
یہی ہے عشق کا غار حرا تو

بچا سکتا تھا اُس کو ڈوبنے سے
اگر وہ ہاتھ میرے چھوڑتا، تو

غزل

تصویرِ خیالات میں اترا کیسے؟
وہ شخص مری ذات میں اترا کیسے؟

دریا جو تجسس کا چڑھا دیکھا تھا
دوچار ملاقات میں اترا کیسے؟

اسباقِ تحمل کے پڑھانے والا
حیراں ہوں، خرافات میں اترا کیسے؟

بھائی کا گلا کاٹ کے بھائی خوش ہے
انسان مفادات میں اترا کیسے؟

پتھریلی ہواؤں سے ہے ریزہ ریزہ
وہ پھول بدن گھات میں اترا کیسے؟

وہ شخص ہتھیلی پہ اجالا رکھے
ظلمت کی سیہ رات میں اترا کیسے؟

جو لوگوں میں پہچان بنا ہے میری
وہ شعرِ خیالات میں اترا کیسے؟

اس طرزِ تغافل پہ ہوں حیراں اکرم
تو شہرِ طلسمات میں اترا کیسے؟

اکرام اکرم

غزل

میری گاڑی کا یہاں وقت ہُوا جاتا ہے
آخری بار میں پوچھوں گا بتا جاتا ہے؟

اس کا بھی خوف بجا ہے وہ گلے کیسے ملے
ایسے عالم میں بھلا کس سے ملا جاتا ہے

کون رہتا ہے سدا ساتھ سفر میں پیارے
وقت پڑنے پہ ہر اک ہاتھ چھُڑا جاتا ہے

چھیل لیتا ہوں اسے یاد کے ناخن سے مگر
وقت کے ساتھ مرا زخم بھرا جاتا ہے

یاد رکھنا کہ گرائیں گے بلندی سے کبھی
جیسے لوگوں کے تو دامن سے جُڑا جاتا ہے

عشق وہ بوجھ ہے جس بوجھ کو ڈھونا مشکل
سر پہ رکھا ہو تو مشکل سے چلا جاتا ہے

زندگی کرتے ہوئے لوگ ملیں گے ہم سے
تنگ گلیوں میں مگر کون خدا جاتا ہے

جانے کس شاخ پہ بیٹھے گا یہ جا کر طاہرؔ
بس تخیل کا پرندہ تو اُڑا جاتا ہے

رانا سرفراز طاہر

غزل

کہیں ستارہ کہیں پہ سورج رکھا ہوا ہے
زمیں رشتوں کے ساتھ انساں بندھا ہوا ہے

وہ گر ملے تو قریب جاکر اسے یہ کہنا
تمھارا وعدہ خیال گھر میں پڑا ہوا ہے

تمھاری مٹھی میں آنسوؤں کے وہ خشک صحرا
ہمارے دل میں بھی ایک دریا چڑھا ہوا ہے

وہ اتنی خوش تھی تبھی سہیلی سے کہہ رہی تھی
وہ شہری بابو بہت زیادہ پڑھا ہوا ہے

میں سوچتا ہوں چلا ہی جاؤں نئے سفر پر
کئی دنوں سے ہمارا دکھ بھی بڑھا ہوا ہے

امجد بابر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک لمحہ تھا جسے آخرِ شب تک دیکھا
رات بھر منتظر اپنا ، در وا اپنا تھا

غزل

شہر میں اپنی دکاں ہونے سے میں
بچ گیا ہوں رائگاں ہونے سے میں

پچھلی صف میں بھی نظر آنے لگا
شاعری میں اب عیاں ہونے سے میں

شہر گاؤں کی زمینیں کھا گیا
رہ گیا ہوں گلستاں ہونے سے میں

جو بڑے ہیں ان کی کم ظرفی کے بعد
ڈر گیا ہوں داستاں ہونے سے میں

یوں حقیقت سے کہانی بن گیا
اک فسانے میں بیاں ہونے سے میں

دیکھتا ہوں اپنی عینک سے میاں!
بچ گیا ہوں بدگماں ہونے سے میں

خاص چہرہ سامنے لاتا نہیں
آئنے کا ترجماں ہونے سے میں

وقت سے پہلے گروں گا ایک دن
اک کرائے کا مکاں ہونے سے میں

اسحاق وردگ

غزلیں

بات ہے گو منقول میاں
لیکن ہے معقول میاں

روز و شب کا حال سنا
اب کیا ہے معمول میاں

خود ہی اپنا قاتل ہوں
خود ہی ہوں مقتول میاں

ایک ہے مصرعہ خوشبو کا
دوسرا مصرعہ پھول میاں

آنکھوں میں اک گنبد ہے
دل میں پاک رسول میاں

ہجر تمہارا چبھتا ہے
بن کر ایک ببول میاں

شافیؔ دل کی بستی میں
اڑتی ہے اب دھول میاں

محسن رضا شافی

دنیا کے سب حسین نظارے خدا گواہ
بس اک نگاہ یار پہ وارے خدا گواہ

دریا یہ کشتیاں یہ کنارے خدا گواہ
شاہد ہیں رہنگوں پہ ہمارے خدا گواہ

تنہائی، ہجر، طعنِ زمانہ، فراق، دکھ
یہ سارے زہر دل میں اتارے خدا گواہ

جیسے بھی گزری ہجر کی شب سو گزار لی
ہم نے مگر نہ مانگے سہارے خدا گواہ

ہر قیس ریت پھانکتا پھرتا ہے دشت کی
جس نے بھی خواب دیکھے تمہارے خدا گواہ

تاثیرؔ ہم نے رکھا ہے پاسِ وفا فقط
ہم لوگ عشق میں نہیں ہارے خدا گواہ

تاثیر جعفری

غزلیں

بہادری ہے کہ یہ بزدلی ؛ نہیں کرتا
میں چاہتے ہوئے بھی خودکشی نہیں کرتا

وہ جس کے ملتا تو ہے، سینے سے نہیں لگتا
چراغ جلتا تو ہے روشنی نہیں کرتا

خدائے قہر و غضب! اس پہ جتنی آفتیں بھیج
یہ شخص پھر بھی تری بندگی نہیں کرتا

مرے بغیر جسے سانس تک نہ آتی تھی
وہ شخص آج مجھے یاد بھی نہیں کرتا

یہ کار خیر مبارک ہو آپ کو گوتم
کہ میں تو عرصہ ہوا، شاعری نہیں کرتا

گوتم ملتانی

سننے نہ بولنے کا ہے ڈھب، تیرے منہ میں خاک
تجھ کو نہیں ہے پاسِ ادب، تیرے منہ میں خاک

اے دوست تیری اپنی زباں تیرے حق میں زہر
اے دوست! تیرے اپنے سبب، تیرے منہ میں خاک

تو جانتا ہے کب ترے اعمال کھلنے ہیں
میں کیا بتاؤں تجھ کو کہ کب تیرے منہ میں خاک

ہم اپنے اپنے حصے کی پھٹکار سہہ چکے
اب تیرے لب پہ خامشی، اب تیرے منہ میں خاک

چکھنے میں اس کا ذائقہ اچھا ہے یا برا
پوچھوں گا تجھ سے آئے گی جب تیرے منہ میں خاک

غزل

خیالِ خاطر بدل رہا ہے ، صریرِ خامہ مچل رہی ہے
جو نظم تیرے لئے کہی تھی، غزل کے سانچے میں ڈھل رہی ہے

وہ چاند چہرہ جو میرے آنگن میں آ کے اک پل ٹھہر گیا تو
شبِ گریزاں کے مرد سینے میں نیند کروٹ بدل رہی ہے

وہ وصل کی رات جس کی خاطر کئی زمانوں کا کرب جھیلا
افق کے سینے میں منہ چھپائے وہ آخری رات ڈھل رہی ہے

تم عہدِ ماضی کے زنگ آلود قفل کھولو تو سوچ لینا
کہ دل میں دیمک زدہ تعلق کی یاد آنسو اگل رہی ہے

بدن گھروندے کی چھت پہ دیکھو اجل کا پنچھی اتر چکا ہے
حیات سیلن زدہ فصیلوں سے قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے

رقیہ اکبر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دم سادھ کے دیکھوں تجھے، جھپکوں نہ پلک بھی
آنکھوں میں سمولوں، ترے لہجے کی دمک بھی

غزلیں

کسی کو دیکھنا اور دیکھتے ہی رہ جانا
پھر اس کو سوچنا اور سوچتے ہی رہ جانا
سوال اس کی نگاہوں سے کھوج کر لانا
جواب ڈھونڈنا اور ڈھونڈتے ہی رہ جانا
یقین ہو تو چلا ہے کہ اپنی قسمت میں
ہے اس کو چاہنا اور چاہتے ہی رہ جانا
میں جانتا ہوں کہ رکنے کا کچھ جواز نہیں
سو میری جان مرے واسطے ہی رہ جانا
جو ایک شخص میسر ہے تجھ کو شام و سحر
چلا گیا تو اسے کھوجتے ہی رہ جانا
اب اس کو ماں کے گزرنے پہ یاد آتا ہے
وہ ہاتھ چومنا اور چومتے ہی رہ جانا
ترے لیے ہے محبت کی تھاپ پر لازم
دھمال ڈالنا اور ڈالتے ہی رہ جانا
یہ تیرا وقت ہے عدنان آج جی لے اسے
یہ کیا کہ خود کو سدا روکتے ہی رہ جانا

عدنان خالد

تمہارے بعد اب کیا رہ گیا ہے
بس اک دورِ گزشتہ رہ گیا ہے
ابھی امید کا دامن نہ چھوڑو
شجر پر ایک پتہ رہ گیا ہے
ہمیں افسوس تھا اس کے کیے پر
مگر اب صرف غصہ رہ گیا ہے
خدا کا شکر ہے دنیا سے بچ کے
جو مجھ میں ایک بچہ رہ گیا ہے
جو دنیا ختم ہونے پر لگے گا
ابھی تو وہ تماشا رہ گیا ہے
اسے کچھ دیر میں احساس ہو گا
ہمارے بن وہ اچھا رہ گیا ہے
وہ اپنے ہاتھ میں خنجر اٹھالیں
بس اب اتنا ہی ہونا رہ گیا ہے
نہیں ملنے کا اب عدنان ہم سے
بتاؤ کیا بہانہ رہ گیا ہے

غزلیں

ذکر میرا جہاں جہاں بھی تھا
اُس میں ٹھہراؤ بھی بلا کا تھا

داستاں زیبِ داستاں بھی تھا
کوئی دریا رواں دواں بھی تھا

ہم زباں بھی تھا ترجماں بھی تھا
کیا ہوا آج جو اکیلا ہوں

کوئی احمد کا رازداں بھی تھا
کبھی تو میرِ کارواں بھی تھا

شوق آوارگی کا تھا ، لیکن
ایک آسیب ساتھ تھا احمدؔ

ساتھ ہی فکرِ سائباں بھی تھا
جس علاقے میں تھا جہاں بھی تھا

اتنی سوئی نہ تھیں مری گلیاں
میرے رستے میں اک جہاں بھی تھا

احمد محسود

نہ کوئی جرم نہ الزام ، مارا جاؤں گا
میں بیگناہ سرِ عام ، مارا جاؤں گا

خزاں نصیبی میری کہہ رہی ہے دنیا سے
میں کوئی شام پے شام ، مارا جاؤں گا

میں کوئی بدرقہ تو ہوں نہیں مگر پھر بھی
کسی یزید کی بیعت نہیں کروں گا میں

کسی کے ہاتھ سے بے دام ، مارا جاؤں گا
اگرچہ لے کے ترا نام ، مارا جاؤں گا

جو کم نظر ہیں انہی زاہدوں کی بستی میں
جہاں پہ بولنا ہی جرم ہو وہاں احمدؔ

بے ننگ و نام کے گمنام ، مارا جاؤں گا
مچاؤں گا جو میں کہرام ، مارا جاؤں گا

غزل

صبح اسرار نو کے اندر ہوں
میں تری دسترس سے باہر ہوں

لاکھ چشمے ابل پڑیں مجھ سے
میں ترے راستے کا پتھر ہوں

جھک کے ملنے سے قد نکلتا ہے
آج میں آپ کے برابر ہوں

میرا ہونا بھی ہے نہ ہونے سے
میں جہاں پر نہیں ہوں ، اکثر ہوں

امن کی جنگ جیتنی ہے مجھے
میں اکیلی ہی ایک لشکر ہوں

ہر سحر مجھ کو دیکھنا چاہے
شام کا دلفریب منظر ہوں

ساری دنیا مرے حصار میں ہے
ساری دنیا کا میں ہی محور ہوں

قصرِ ہجرت میں سو رہی ہوں میں
در بدر ہوں تو اپنے گھر پر ہوں

ہر کوئی بس جمال دیکھتا ہے
ورنہ کوثر نہیں ، قلندر ہوں

سیدہ کوثر منور

غزلیں

نائلہ راٹھور

کبھی فرصتوں میں یہ سوچنا دلِ مضطرب کہ یہ کیا ہوا
نہ طلب رہی ترے ساتھ کی نہ ہی عہد مجھ سے وفا ہوا

کبھی تیرے دل میں تھے جاگزیں ترے عشق کا ہی حصار تھا
نہیں معتبر مرا عشق آج ہوں سنگِ راہ تو کیا ہوا

نہیں منتظر ہے کوئی نگاہ نہ کسی کے دل میں کسک کوئی
وہی اجنبی سے ہیں رات دن ہے وہیں پہ وقت رکا ہوا

کبھی تم بھی تھے مرے ہمسفر مجھے یاد بھی نہیں اب رہا
ہے عجب طرح کی یہ تشنگی کہ چراغِ دل ہے بجھا ہوا

مرے راہبر کو خبر کرو کہ میں قافلے سے بچھڑ گئی
مری منزلیں ہوئیں بے نشاں مرا بخت مجھ سے خفا ہوا

وہی جوت آنکھ کی جل اٹھی تمہیں دیکھ کر سرِ راہ اب
کوئی شعلہ پھر سے بھڑک اٹھا کہ جو راکھ میں تھا دبا ہوا

رداحاصل خلوص

وہ میری نیند چرانے کی بات کرتا تھا
اور اپنا خواب سجانے کی بات کرتا تھا

وہ میری مانگ میں افشاں سجا نہیں پایا
غزل میں رنگ لٹانے کی بات کرتا تھا

میں تیرے بعد کسی اور سے نبھا لوں گا
شریر تھا، سو ستانے کی بات کرتا تھا

وہ کوئی خواب تھا شاید، کہ پھر زبوں حالی
تھما چراغ کے گھرانے کی بات کرتا تھا

اس اعتراف پہ ہچکی سی بندھ گئی اس کی
میں غم ہنسی میں اڑانے کی بات کرتا تھا

سے کے زیر و زبر ہی سمجھ نہیں پایا
سے پہ دھاک جمانے کی بات کرتا تھا

پھر ایک روز بہت آسماں ہنسا اس پہ
خلافِ بخت کے جانے کی بات کرتا تھا

غزل

لوگ اس رنج گمرہی میں رہے
شاعری بزم بے خودی میں رہے

سب تعاقب مہک کا کرتے رہے
ہم تو پھولوں کی نازکی میں رہے

دیر تک فن چھپا رہا دل میں
جیسے اک تان بانسری میں رہے

اپنے دکھ درد سب بھلا ڈالے
ایک تصویر کی ہنسی میں رہے

وہ چکاچوند تھی نگاہوں میں
ہم بڑی دیر تیرگی میں رہے

رنگ سب دلنشین موسموں کے
اس کے لہجے کی چاشنی میں رہے

فخر میں عمر کٹ گئی ساری
چند روز ان کی دوستی میں رہے

کیوں نہ خوشبو رومال سے آئے
جو گلابوں کی ٹوکری میں رہے

ان کو شوخی پسند آتی رہی
ہم بڑی دیر سادگی میں رہے

رس رہے گھولتے سماعت میں
بہتے جھرنوں کی نغمگی میں رہے

ترس آتا ہے پارساؤں پر
جو سمجھتے ہیں راستی میں رہے

آپ اپنی نہیں ستائش کی
ہم جلی تھے مگر خفی میں رہے

دل کشی کھو کے رہ گئی ان میں
وہ جو منظر کی دل کشی میں رہے

کس پہ تنہائی کا دھریں الزام
آپ ہی اپنی خودسری میں رہے

دل سے ہر پل دعا نکلتی ہے
وہ جہاں ہے سلامتی میں رہے

ہم نے چپ چاپ راہ لی گھر کی
وہ مگن خود ستائشی میں رہے

کمرہ ترتیب سے سجا ڈالا
ذہن اور دل تو کھلبلی میں رہے

ایسے اس قرب میں رہی جیسے
رات کی رانی چاندنی میں رہے

لمس سے شاخ جھومنے لگی تھی
پھول تادیر تازگی میں رہے

کشش ایسی تھی اس کی صورت میں
عمر بھر ہم مگن اسی میں رہے

خاک آزادیاں ہماری ہیں
ایک زنجیر کی کڑی میں رہے

رابطہ عمر بھر رہا قائم
پھر بھی اک طرفہ بے کلی میں رہے

بے نیازی کو تھام کر رکھا
اور مگن بندہ پروری میں رہے

بس گیا پیار دو دلوں میں جب
خوش بہت ایک جھونپڑی میں رہے

علم نے اضطراب بخشا ہے
مطمئن عہدِ گمرہی میں رہے

زخم پر زخم وہ لگاتے رہے
منہمک ہم رفوگری میں رہے

گھر میں بیٹھے ہوئے بھی لگتا ہے
جیسے رنجِ مسافری میں رہے

ایک منظر میں سو دکھاتا ہے
وہ تحیر جو حیرتی میں رہے

دوسروں کے نہ غم نظر آئے
اپنی خواہش کی پیروی میں رہے

جس نے بے لوث عمر بھر چاہا
کیوں نہ گم اس محبتی میں رہے

کہیں الجھے نہیں کسی سے ہم
پر سکوں اپنی خامشی میں رہے

سب وسائل اگر میسر تھے
کس لیے حال بے کسی میں رہے

سن کے سرمست ہو گئی محفل
شعر تاثیر مے کشی میں رہے

میرا مشکیزہ ہو گیا خالی
اور احباب تشنگی میں رہے

دھول ہی عنبرینؔ چاٹتے ہیں
وہ جو احساسِ برتری میں رہے

عنبرین خان

غزلیں

کس نے خدا کو اب بھی پکارا زمین پر
کس کا ہوا ہے اتنا خسارہ زمین پر

کہتا تھا جس کو اپنے مقدر کا آسماں
دیکھو میں ایسے شخص کو ہارا زمین پر

حیران ہو کے سنتے ہیں اہلِ فلک سبھی
ہوتا ہے ذکر جب بھی تمہارا زمین پر

مل جاتا ایک پل جو محبت کے واسطے
کر لیتا حشر تک میں گزارا زمین پر

تقسیم ہے غلط یہ زمینی خداوں کی
اس نے تو رزق سب کا اتارا زمین پر

مٹی سے دیر تک نہ نمی جائے گی ایاز
اک اشک گر گیا ہے ہمارا زمین پر

محمد علی ایاز

کھول مجھ پر مرے خدا مجھ کو
میں بھی کیا ہوں کبھی دکھا مجھ کو

ریزہ ریزہ ہوں ایک مدت سے
پھر سے اے کوزہ گر بنا مجھ کو

ہار جاؤں نہ میں تماشے میں
اس قدر بھی نہ آزما مجھ کو

یوں تو اڑنے کی بھی اجازت تھی
اس نے زندان میں رکھا مجھ کو

میں تو حصہ ترے وجود کا تھا
تو نے سمجھا تھا دوسرا مجھ کو

کس سے جا کر کہوں میں حال دل
کون سمجھے ترے سوا مجھ کو

یونہی نائب نہیں بنایا مجھے
جانتا ہے مرا خدا مجھ کو

تیری خاطر ہی تجھ کو چھوڑا تھا
کس لئے دیتا ہے صدا مجھ کو

اک محبت سے میں ہوا برباد
اک محبت کا آسرا مجھ کو

محمد حماد خاں

درخانہ اگر.....

علم وادب میں کسی نہ کسی بات سے اختلاف صحت مندانہ رجحان ہے۔ اس سے نہ صرف فریقین کو فائدہ ہوتا ہے، دیگر پڑھنے والے بھی مستفید ہوتے ہیں۔ میرے مضمون تلخ و شیریں میں میرے یہ الفاظ ''صوبہ پنجاب میں بولی جانے والی سرائیکی ہو یا پنجابی'' نقل کرتے ہوئے ازہر منیر صاحب نے لکھا ہے کہ محمد ارشاد ''نہیں جانتے کہ پنجابی کو تقسیم کرنے کی سازش کی بنیاد گریرسن نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا میں کوئی سو سال پہلے رکھی تھی اور اس سازش کو عملی جامہ 1962 میں پہنایا گیا۔ سرائیکی دیس پنجاب کے کسی علاقے کی زبان نہیں یعنی صادق آباد سے میانوالی، راولپنڈی، ہری پور ہزارہ، یہ سندھی کی بجائے بولیوں میں سے ایک بولی ہے۔''

منیر صاحب جسے دیس پنجاب کہہ رہے ہیں اس کا پنجابی میں کوئی نام ہی نہیں۔ پنجاب فارسی زبان کا لفظ ہے پنج آب یعنی پانچ دریاؤں کی سرزمین جہلم، راوی، چناب، ستلج، بیاس کے درمیان کی سرزمین۔ سرحد پار سے آمدہ فاتحین کا دیا ہوا نام۔ کیا منیر صاحب نے کبھی اپنے آپ سے یہ پوچھا ہے کہ جب انگریزوں نے لاہور میں یونیورسٹی قائم کی تو اس کا نام یونیورسٹی آف دی پنجاب نام کیوں رکھا، یونیورسٹی آف پنجاب کیوں نہیں رکھا، بحالیکہ پنجاب اسم معرفہ ہے بنگال کو دی بنگال، دکن کو دی دکن کبھی نہیں کہا۔ اس لیے کہ پنجاب اور دی پنجاب (پنج آب) کا فرق ملحوظ تھا۔ پنجاب انتظامی یونٹ کا نام ہے اور دی پنجاب پنج آب۔ انگریزوں سے پہلے پنجاب دو صوبوں پر مشتمل تھا۔ ایک صوبے کا نام صوبہ لاہور تھا اور دوسرے کا نام صوبہ ملتان (ابو الفضل، آئین اکبری) لاہور پنجاب کا کا مرکز تھا۔ میں کوئی سازش نہیں کر رہا تاریخی حقائق بیان کر رہا ہوں انگریزوں نے جب پنجاب کو صوبہ (انتظامی یونٹ) بنایا تو اس میں سابقہ این ڈبلیو ایف بھی شامل تھا جو 1900 تک شامل رہا، پچاس سال تک۔ بعد ازاں 1901 میں ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈی آئی خان کو الگ کر دیا (مردان پشاور کی تحصیل تھا)۔ یہ وہ علاقے

محمد ارشاد

تھے جو مغل سلطنت کے صوبہ کابل میں شامل تھے نہ کہ پنجاب کا حصہ۔ پنجاب (دیس پنجاب) جہلم کے بائیں کنارے سے شروع ہوتا ہے اور راولپنڈی اس دیس میں شامل نہیں چہ جائیکہ صادق آباد سے میانوالی، ہری پور ہزارہ۔ اورنگزیب عالمگیر کے ہم عصر ایک گکھڑ شاعر رعنا شادمان کے ذکر میں اسی دور کے تذکرہ نویس شاعر افضل سرخوش نے کلمات الشعراء میں لکھا ہے: از سلاطین زادہ ہائے قوم گکھڑ است۔ ملک ایشاں مابین پنجاب و حسن ابدال است۔ قوم گکھڑ کا وطن پوٹھوہار ہے جو جہلم کے دائیں کنارے سے مارگلہ تک ہے اور راولپنڈی صدر مقام۔ حسن ابدال اٹک کی تحصیل ہے۔ پوٹھوہار سے باہر۔ محترم منیر صاحب کے ذہن میں گریٹر پنجاب کا کوئی ہیولی یا نقشہ ہے تو وہ اس میں این ڈبلیو ایف کو بھی شامل سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بھی ہری پور ہزارہ سمیت 1850 سے 1900 تک پنجاب میں شامل رہا ہے۔ ڈسٹرکٹ ہزارہ کا نام انگریزوں کی آمد سے پہلے پکھلی سرکار تھا اور مغل سلطنت کے صوبہ کابل کی ایک سرکار (ضلع)۔ (آئین اکبری) ہری پور ہزارہ کے مغربی اور شمال مغربی دیہات میں پشتو بولی جاتی ہے۔ یہی زبان پکھلی (مانسہرہ) کے کئی دیہات کی ہے۔ بعض دیہات ایسے بھی ہیں جن میں سوائے پشتو کے کوئی اور زبان بولی اور سمجھی نہیں جاتی۔

فاضل منیر صاحب کے ذہن میں گریٹر پنجاب کا ہیولی اپنی جگہ، میں پنجاب کے خلاف کوئی سازش نہیں کر رہا تاریخی حقائق بیان کر رہا ہوں۔ گریئرسن نے بھی کوئی سازش نہیں کی لنگوسٹک سروے آف انڈیا پورے برٹش انڈیا کے بارے میں ہے لنگوسٹک سروے آف پنجاب نہیں۔ موجودہ صوبے بھی انگریزوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی آہنی دیوار نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ سرائیکی سرائیکی ہے سندھ میں بولی جائے یا پنجاب میں۔ انگریزی کا Stone جرمن کا شٹائن Stein سویڈش کا Stenk ایک ہی چیز ہیں اسی طرح متعدد دیگر الفاظ۔ اس کے باوصف تین الگ زبانیں۔ مزید پیچھے جائیں لاطینی کا Peter اور ہندی کا پتھر ایک ہی چیز۔ یہی لفظ انگریزی کے Petrify میں موجود ہے۔ انگریزی کا daughter جرمن کا tochter (توختر) سنسکرت کا دوہتر دری کا دختر فارسی کی فارسی کا دوور پشتو کا لور پنجابی کا دھی۔ پشتو میں د کی آواز ل سے بدل گئی اور پنجابی میں ت اور ر کی آواز کم ہو

گئی۔ فارسی کا دیوار پشتو میں دیوال کوہستانی میں وال اور انگریزی میں wall۔ اسی طرح eight، acht (اخت، جرمن) ہشت (فارسی) اُشٹ (پالی) آٹھ (ہندی) اَٹھ (پنجابی) اَتہ (پشتو) ۔ انگریزی سے gh کی آواز گر گئی پہلے موجود تھی اب صرف ہجوں میں۔ یہی آواز جرمن میں خ کی صورت میں فارسی میں ش میں مبدل، پشتو، ہندی اور پنجابی سے غائب۔ آواز کی تبدیلی ایک زبان میں بھی ہو سکتی ہے۔ شمالی پشتو میں خزہ (عورت) جنوبی پشتو میں شزہ اور متعدد الفاظ میں خ مبدل ہے ش سے۔ انگریزی سے پنجابی تک سب ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی کا قریب کا رشتہ ہے کسی کا بہت دور کا لیکن سب کی نسل باوا آدم ایک ہے۔ یہی حال سامی خاندان کی زبانوں عربی، ایتھوپیائی، آرامی کنعانی، بابلی، آشوری کا ہے۔ کنعانی مزید شاخوں موآبی، فونیقی اور عبرانی میں تقسیم ہو گئی۔ آج ان میں سے کوئی زبان موجود نہیں۔ عبرانی (Hebrew) dlaspora کی صدیوں میں بالکل محو ہو گئی تھی۔ عصر حاضر کے یہودیوں نے اسے دوبارہ recontruct کیا ہے۔ لاطینی زبان بھی صرف کتابوں میں ہے یہ بھی فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، پرتگیزی اور رومانی (رومانیہ) زبانوں میں بٹ گئی۔ لاطینی بولنے والا کوئی موجود نہیں۔

دنیا کی کوئی زبان خود کفیل نہیں۔ ہر زبان میں دوسری زبانوں سے مستعار الفاظ موجود ہیں۔ ہم tea کو انگریزی کا چائے کو برصغیر کی زبانوں کا لفظ گمان کرتے ہیں حالانکہ یہ چینی لفظ کی تبدیل شدہ صورتیں ہیں۔ اسی طرح rice کو ہم انگریزی زبان کا لفظ سمجھتے ہیں، جبکہ یہ تامل زبان کا لفظ ہے۔ انگریز اس جنس سے سب سے پہلے اسی نام سے آگاہ ہوئے۔ یہی لفظ پشتو میں وروڑی، وریڑی اور فارسی میں برنج متلفظ ہوا۔ جبکہ چاول اور چانول بھی برصغیر کی زبانوں کا لفظ ہے۔ قلم عربی کا نہیں یونانی کا لفظ Calam ہے، اور قرطاس (Chartas) بھی۔ کئی اور بھی۔

بے شک پنجابی زبان کا ذخیرۂ الفاظ اردو سے زیادہ ہے اور آوازیں بھی زیادہ ہیں اور شاعری بھی اردو شاعری سے زیادہ ثروتمند، اس کے باوصف اس کا شمار دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں نہیں ہوتا۔ اردو کا بھی نہیں ہوتا۔ محض الفاظ اور آوازوں کی زیادتی کسی

زبان کو اونچے درجے پر فائز نہیں کر سکتی۔ پنجابیوں نے ان مخصوص آوازوں کے لیے علامات وضع نہیں کیں کہ مجھ ایسے آدمی کے لیے پنجابی پڑھنا آسان ہو۔ پنجابی شاعری کی اپنی بحریں بھی ہیں نہ کوئی نام ہیں نہ عروض کا کوئی نظام ہے۔ اس کے مقابلے میں پشتو میں اپنا نظام بحور ہے (بحر کو سیلابہ اور رکن کو چپہ کہا جاتا ہے) بلکہ حروف کی علامات تک موجود ہیں مثلاً %، کو% کو شمالی پشتون کوگ (ٹیڑھا) اور جنوبی پشتون کوڑ (فارسی کج اور کڑ) پڑھے گا۔ رہی بات آوازوں کے زیادہ ہونے کی تو یہ خوبی دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی ہے۔ ہمارے لیے ز، ذ، ظ، ض اور ث، س، ص اور ح، ہ اور ع، ا، ہم آواز ہیں جبکہ عربی میں ایسا نہیں۔ جرمن میں u اور ü دو مختلف آواز رکھتے ہیں، ü کی آواز جرمن لوگ ہی حلق سے نکال سکتے ہیں۔ انگریزی کے لفظ Speed کو اردو بولنے والا اسپیڈ بولے گا اور پنجابی سپیڈ (س پر زبر کے ساتھ) لیکن ایک پشتون درست ادا کرے گا کہ پشتو میں سترے (تھکا ہوا) سترگہ (آنکھ) ستن (سوئی) ستا (تیرا) ورور (بھائی) کے سے کئی الفاظ میں حرف اول پر زبر، زیر، پیش موجود نہیں، strange، Strong، brother کے سے الفاظ کو درست طور پر ادا کرنا اردو پنجابی والوں کے اور بھی مشکل ہے نیاز فتحپوری نے اپنی ایک تحریر میں علامہ اقبال کی زبان سے قلم کو کلم کہتے سن کر حیرت، مایوسی، طنز کے ملے جلے لہجے میں واقعہ بیان کیا۔ نیاز فتحپوری نے ولی دکنی کے ہموطنوں کو بھی قلم کو بارہا ظلم کہتے ہوئے ضرور سنا ہوگا چاہے تہران (ایران) کے کسی شخص کو قلم کو غلم کہتے نہ سنا ہو۔ نیاز فتحپوری بھی سکول کو اسکول اور speed کو اسپیڈ کہتے رہے ہوں گے۔ کسی بھی کمیونٹی کے بچے کے Vocal glands جس طرح متکامل ہوتے ہیں آوازیں ان کے تابع ہوتی ہیں۔ فارسی میں آوازیں کم ہیں مذکر مؤنث الفاظ و افعال کا بھی امتیاز نہیں۔ سنگ (پتھ) نان، آب نہ مذکر ہیں نہ مؤنث، "ٹھہرانا جلد بازی ہوگا یا ٹھہرانا جلد بازی ہوگی" کی طرح کا امتیاز موجود نہیں۔ صرف ایک آواز کے گفتن سے گفتنی، کردن سے کردنی کے اضافے سے معنی میں جو اضافہ اور وقت میں بچت ہوتی ہے اس کی مثال برصغیر کی کسی دوسری زبان میں موجود نہیں۔ ہرگل خاردارد کا ترجمہ اردو (ہندی)

میں ہر پھول کا کانٹا رکھتا ہے سراسر غلط ترجمہ ہے- every rose has thozn درست ترجمہ- فارسی میں گل سے مراد صرف اور صرف rose ہے اگر پھول کے معنوں میں استعمال کرنا ہو تو پھول کا نام لینا ضروری ہے، گل نرگس، گل یاسمین وغیرہ جن کے ساتھ کانٹا نہیں ہوتا- ہم rose کو گلاب (گل آب (rose water) کہتے ہیں، گل اور ہے اور گل آب (گلاب) اور:

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوے اوست
آمیختن بیادۂ صافی گلاب را

....

فارسی کے بعض مخصوص اوصاف نے نہ صرف اس زبان کو دنیا کی آسان ترین بلکہ شیریں ترین زبان بنا دیا ہے:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیریں تر است
(اقبال)

کسی زبان سے نفرت یا کسی زبان کے حق میں بے جا تعصب کوتاہ نظری اور کوتاہ فہمی ہے- ساری زبانیں بنی آدم کی زبانیں ہیں- تھا (واحد مذکر) تھے (جمع مذکر) تھی (واحد مؤنث) تھیں (جمع مؤنث) متعلق بہ ماضی ہیں- مصدر، حال اور مستقبل کے صیغے ہندی میں موجود نہیں، سرائیکی میں موجود ہیں مصدر (تھینا) حال (تھیندا، تھیندی، تھیندے) مستقبل (تھیسی) بودن (فارسی) کا ترجمہ سرائیکی میں ممکن ہے اردو میں نہیں- اس قسم کے اختلاف کے باوصف ساری زبانیں متعدد ناموں، سے موسوم اور متعدد خاندانوں اور شاخوں میں منقسم ہو کر بھی اصل سے ایک ہیں- الفاظ اور آوازوں میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں کمی بیشی بھی ہوتی رہی ہے- رُخ (پشتو) مکھ (ہندی) mouth (انگریزی) mund (جرمن) مُونہہ اور مُنہ (ہندی، پنجابی) بلحاظ اصل ایک ہیں- رُخ کا خ مکھ میں مبدل بہ کھ اور م پر زبر کی جگہ پیش انگریزی میں th کی آواز موجود جرمن میں th کی جگہ d کی آواز، جرمن ن کی آواز موجود، ماؤتھ سے ساقط مونہہ اور منہ میں موجود، رُخ اور مکھ سے ساقط- اس طرح کی تبدیلیوں کا تعلق Philology اور Phonetics کے علاوہ etymology سے بھی ہے:

درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

☆☆☆☆☆

میرا محسن، میرا مربی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

سلمیٰ اعوان

پہلا تعارف اردو ڈائجسٹ سے 1962 میں ہوا۔ ریڈرز ڈائجسٹ سے بچپن کی شناسائی تھی کہ بڑے ماموں اور منجھلے ماموں جب بھی چھٹیوں پر گھر آتے اُن کے ساتھ یہ رسالہ ضرور ہوتا۔ دسمبر جنوری کی میٹھی سی دھوپ میں چھت پر بچھی ننگی چارپائی پر لیٹ کر اسے پڑھنا دونوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب بھی وہ ظہر یا عصر کی نماز کے لیے مسجد جاتے تو اِس کی پھولا پھرولی کرنا میرا محبوب مشغلہ ہوتا۔ گو کہ ٹاٹ سکول میں پڑھنے والی لڑکی کی انگریزی دسویں میں پہنچ جانے کے باوجود بھی بس ایویں سی تھی۔

مگر وہ جو کہتے ہیں خود کو کچھ خاص ثابت کرنے کا شوق تو چھوٹی عمر سے ہی تھا۔ بستے کو فضول کتابوں سے بھر کر اُسے بڑا اور بھاری بنا کر خود کو کسی بڑی کلاس کی پڑھاکو لڑکی کا تاثر دینے اور ہر شام کو انگریزی کے بیس بار پڑھے ہوئے رٹے ہوئے اسباق سے کسی چنیدہ سے پیراگراف کو اُونچے اُونچے پڑھنا کہ دودھ دینے کے لیے آنے والا لڑکا جو خود غالباً ایف ایس سی کا سٹوڈنٹ تھا متاثر ہو کہ لڑکی کتنی لائق ہے

جیسی شوبازیاں میرے اندر بہت تھیں۔

1962 کا آوائل تھا۔ گھر میں اردو زبان میں ریڈرز ڈائجسٹ کے رنگ ڈھب کا ایک نیا پرچہ آیا۔ بڑا دلچسپ اور منفرد سا لگا۔ گو میرے فکری شعور میں ابھی وہ پختگی نہیں تھی جہاں میں اداریے کی سیاسی تجزیاتی تحریر کو پرکھتی۔ تاہم میرے لیے اُس میں دلچسپی کا خاصا سامان بھی تھا کہ بڑے لکھنے والوں کی کہانیاں، نامور شخصیت کا انٹرویو، شکاریات، جاسوسی کہانی، کسی دوسری دنیا کا سفرنامہ، شعروادب، غرض کہ ہر نوع کا ذائقہ موجود تھا۔ الطاف فاطمہ سے محبت کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا۔ ادارتی ٹیم سے تعلق ذرا بعد میں پیدا ہوا۔ الطاف حسن قریشی چونکہ ہر دفعہ کسی بڑی سیاسی یا سماجی شخصیت سے تعارف کرواتے۔ تحریر اور پیش کش کا انداز بھی بڑا منفرد، جذباتی اور وطن کی محبت و سرشاری میں بھیگا ہوا ہوتا۔ اُن سے عقیدت اور محبت کا رشتہ ذرا جلدی استوار ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کی کبھی کبھی کوئی تحریر نظر سے گزرتی۔

میرے اندر مشرقی پاکستان سے محبت، وہاں جانے اور وہاں کے بارے کچھ لکھنے کی خواہش کا محرک اردو ڈائجسٹ اور الطاف حسن قریشی تھے جن کے سلسلہ وار مضامین اردو ڈائجسٹ میں چھپ رہے تھے۔ اس وقت تک میں ایک دو کچے پکے ناول لکھ بیٹھی تھی۔ میرا تو وہ حال تھا کہ پوڈا پوڈا چڑھنے کے بجائے پٹوسی مار کر سیدھی چھت پر جا بیٹھی تھی۔ بندہ چھوٹی موٹی کہانیوں اور افسانوں سے بسم اللہ کرتا ہے پھر ناول کے چھابے میں ہاتھ ڈالتا ہے مگر نہیں جی ہماری تو ہر بات ہی نرالی تھی۔

تاہم اردو ڈائجسٹ میں لکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ میری مرعوبیت تھی ڈھاکہ یونیورسٹی میں میری کلاس فیلو ارمانیہ احمد بھی تھی۔ بہار کی اردو اسپیکنگ جس نے مجھے بتایا کہ وہ اردو ڈائجسٹ میں افسانے لکھتی ہے۔ مجھے آج بھی اپنا تعجب سے بھرا "ہیں" کہنا یاد ہے۔ میری آنکھوں میں رشک اور حسد دونوں جذبے بیک وقت ابھرے تھے۔ میری آواز میں حسرت کا سا چھلکاؤ تھا جب میں نے کہا تھا۔

"اردو ڈائجسٹ میں چھپتی ہو تم۔" وہ یقیناً بڑی اونچی شے نظر آئی تھی مجھے۔

ڈھاکہ میں میرپور اور محمد پور خالصتاً اردو بولنے والوں کے علاقے تھے۔ سہیلیوں کے گھروں میں جانا ہوتا تو ہر گھر کے چھوٹے بڑے ڈرائنگ روم میں اردو ڈائجسٹ کے پرچے کا ہونا ضروری امر ہوتا۔ پرانے پرچے نفاست اور سلیقے سے بک شیلفوں میں سجے ہوئے ہوتے۔ عید الفطر پر میں

نے دھان منڈی کے اُس گھر میں جانے کو ترجیح دی جہاں اردو ڈائجسٹ کے پرچے جلدوں کی صورت محفوظ تھے اور مجھے انہیں پڑھنے کی پوری آزادی تھی۔ یہیں میں نے ڈاکٹر اعجاز کو پڑھا۔ اُن کے جرمنی میں قیام کی داستان نے بھی بہت متاثر کیا۔ یہ زمانہ اردو ڈائجسٹ کے عروج کا تھا۔

1971 میں سقوط ڈھاکہ ہو گیا۔ الطاف حسن قریشی کے تو تے جو محبت کا زمزم بہہ رہا ہے کے عنوان سے چھپتے تھے اور میرا دوہرا ناول تنہا دہائیاں دیتا رہ گیا کہ یارو کچھ تو سوچو مغربی پاکستان تنہا رہ جائے گا۔ اسے تھامت کرو۔ مگر سنے کون؟

یہ **1977** کا زمانہ تھا۔ اخبار میں ایک اشتہار چھپا کہ ہفت روزہ سیاسی پرچہ ”زندگی“ جو اردو ڈائجسٹ کے بینر تلے نکل رہا تھا کے لیے خاتون رپورٹر کی ضرورت ہے۔ اب خود سے کہتی ہوں۔

”چلو میاں شادی شدہ زندگی کے بہتیرے مزے لوٹ لیے ہیں۔ بچوں کے گو موت میں اماں کے ساتھ مددگار بھی ہے۔ تو باہر نکل۔ اپنا چھ سال کا زنگ اتار۔“

سمن آباد بس سٹاپ سے **21** ایکڑ سکیم پہنچنے تک میرے ساتھ ساتھ جذبات کا ایک ہجوم بے کراں بھی چلا کہ میں ایک ایسے مکتب فکر میں داخل ہونے جا رہی تھی جہاں ایک طرف دائیں بازو کے چوٹی کے صحافی پروان چڑھے تھے تو وہیں بائیں بازو کے لوگ بھی مزے سے لکھتے اور نوکریاں کرتے تھے۔ انٹرویو ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی نے لیا۔ انٹرویو کیا تھا۔ مزے مزے کی باتیں۔ مشرقی پاکستان زیادہ زیر بحث رہا۔ لیجیے تنخواہ کام وام سب طے ہو گیا اور میں زندگی اور اردو ڈائجسٹ ٹیم کا حصہ بن گئی۔

خشخشی داڑھی والا یہ ہنستا مسکراتا کبھی کبھی قہقہے لگاتا تھری پیس سوٹ میں ملبوس شخص مجھے بڑا اپنا سا لگا کہ انہوں نے میرے ساتھ جرمنی میں اپنے ڈاکٹریٹ کے دنوں کی یادوں اور تجربات کو شیئر کیا تھا۔ اس وقت سمن آباد کے پہلے گول چکر کے پاس دفتر تھا۔ دو منزلہ عمارت کا سارا نچلا حصہ چھوٹے چھوٹے دو رویہ کمروں اور تنگ سی راہداری کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ عمارت میں داخلے کے ساتھ ہی الطاف حسن قریشی کا کمرہ، ذرا آگے ڈاکٹر صاحب اور پھر آگے عملے کے کمرے شروع ہوتے تھے۔

چند دنوں بعد پتہ چلا کہ اوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب کی پہلی بیگم بڑی بھابی جی رہتی ہیں۔ ایک دن کسی نے سرگوشی میں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی دو بیویاں ہیں۔ خاندانی بیگم اوپر کی منزل میں رہتی ہیں اور محبت کی ڈور میں بندھنے والی بیگم کوئی سو گز

پرے پچھواڑے کی کوٹھی میں مقیم ہیں۔
ڈاکٹر صاحب اولاد کے معاملے میں بڑے خوش نصیب ہیں۔ بڑی بھابی کے ماشاءاللہ سے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں اور چھوٹی بیگم کے چھ بیٹے ہی ہیں۔
"ماشاءاللہ بارہ بیٹے۔ آنکھیں پھٹیں۔ اتنے بیٹے تو بادشاہوں کے ہی ہوتے ہیں۔" تعجب بھرا لہجہ محسوس کرتے ہوئے مخاطب نے کہا۔
"بھئی ڈاکٹر صاحب بھی تو بادشاہ ہی ہیں۔"
ایک دن بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔
"چلئے بھئی ہم آپ کو اپنی دوسری بیگم سے ملواتے ہیں۔"
لیجئے صاحب گھر پہنچ گئے۔ اب جو چھوٹی بیگم پر نظر پڑی تو فضا میں خوشی سے کلکاریاں سی گونجیں۔ چٹکیاں پڑیں کہ وہ تو میری کالج فیلو ہی نہیں انگریزی اور ہسٹری میں کلاس فیلو بھی نکلیں۔ ڈاکٹر صاحب کھڑے ہنس رہے ہیں اور ہماری چٹکیاں ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہیں۔
کالج کے زمانے اور بالخصوص ہمارے وقتوں میں مذہبی رواداری کا دور دورہ تھا۔ کون کس مسلک سے ہے؟ کسی کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ سو میں تو جانتی ہی نہ تھی کہ میری کلاس فیلو کا تعلق شیعہ مسلک سے ہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد یہ بات بھی ایسے ہی کسی کولیگ سے سننے کو ملی کہ چھوٹی بیگم شیعہ مسلک سے ہیں۔ میں نے بات کرنے والے کو دیکھا اور کہا۔
"مگر گھر میں تو ذرہ برابر اس کا احساس نہیں ملتا۔ علی کے ساتھ عمر اور عثمان ناموں کی پکار بھی سنائی دیتی ہے اور پکار میں پیار کی للک کا اظہار بھی ہوتا ہے۔"
دراصل اب ہم جماعتی دوستی میں بدل گئی تھی اور کبھی کبھار گھر جانے والا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اور ایک بار جب اسی موضوع پر بات ہوئی اور میں نے پوچھا۔ کنیز اعجاز کا جواب تھا۔
"ڈاکٹر صاحب بہت بڑے دل والے انسان ہیں۔ عظیم لفظ میرے حسابوں ان کے لیے چھوٹا ہے۔ انہیں محبتیں کرنے اور نبھانے کا بہت سلیقہ ہے۔"
بالعموم میں ہفتے میں دو تین دن ہی آفس جاتی تھی۔ گیارہ بجے ان کا ٹی ٹائم ہوتا۔ وہ اکیلے چائے پینے کے عادی نہ تھے۔ اگر ان سے ملنے والے خصوصی مہمان نہ ہوتے تو پھر حاضری کا بلاوہ ہمیں آ جاتا۔ اخلاق احمد دہلوی، محسن فاروقی یزدانی جالندھری، آباد شاہ پوری کے ساتھ میں بھی حاضر ہو جاتی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک

مسحور کن مہک آپ کا استقبال کرتی۔ سائڈ ٹیبل پر دھری بڑی سی ٹرے میں نفاست سے سجے کپ، چمچ، بسکٹ اور ٹی کوزی سے ڈھنپی چائے دانی اور کمرے میں گردش کرتی خوشبو مجھے کچھ یاد دلاتی۔ بڑے ماموں یاد آتے۔ اُن کا گلگتی نوکر اور چائے کی پیش کش کا یہی ارسٹوکریٹک کا سا انداز۔

بڑی بھابی چائے بنانے کی ماہر۔ ڈاکٹر صاحب چائے پینے اور پلانے کے شوقین۔ ہم تو لطف اٹھانے والوں میں سے تھے۔ سو وہ کپ آبِ حیات کی طرح پیتے۔ آدھ پون گھنٹہ اُن سے گپ شپ کرتے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجوایٹ تھے۔ اُن کے فکر و عمل پر وہی سوچ غالب تھی۔ کاروانِ علم فاؤنڈیشن کا قیام اور اس کے لیے ان کی حد درجہ مخلصانہ کاوشیں یقیناً اُن کے ایسے ہی احساسات کی ترجمان تھیں۔ کتنے دیے روشن کیے کوئی حساب نہیں۔ اپنے کارکنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تو میں خود گواہ ہوں۔

ملک کے نامور صحافی ہارون الرشید بھی کچھ عرصہ "زندگی" سے منسلک رہے۔ ایک بار گھر میں سفیدیاں ہو رہی تھیں۔ بہت دنوں بعد دفتر گئی۔ ہارون صاحب بڑے جز بز سے تھے۔

"اتنی چھٹیاں۔" پوچھا گیا۔ وجہ بتائی۔ بولے" تو سفیدیاں کام کرنے سے روکتی ہیں۔"

"جی۔ یہ تو ذرا آج جا کر بیگم سے پوچھیے۔" بڑی تپ چڑھی تھی مجھے۔ اب ڈاکٹر صاحب کے پاس کھڑی بول رہی ہوں۔

"یہ کس کو آپ نے میرے سر پر لا بٹھایا ہے۔ اب یہ میری تنخواہ کٹوائے گا۔"

اور وہ مہربان سا شخص میرے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "نہیں کٹے گی بھئی نہیں کٹے گی۔ پر تم بھی کسی نظم و ضبط میں تو آؤ۔ اتنے دن سے غائب ہو۔"

"تو کیا؟ کام تو دے کر گئی تھی۔"

زندگی کے ساتھ اردو ڈائجسٹ کے لیے اکثر افسانہ لکھنا، کسی سماجی یا معاشرتی مسئلے پر سروے کرنا یا کسی خصوصی نوعیت کا کوئی مضمون تحریر کرنے کو بھی اکثر کہہ دیا جاتا جس کی ادائیگی الگ سے ہوتی تھی۔ یہ طے شدہ فارمولے کے تحت فی صفحہ والے حساب کتاب کے کھاتے میں جاتا تھا۔ جو بل بنتا میں اکثر اس سے مطمئن نہ ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ جاتی۔ غصے سے بولتی۔ "مضمون دیکھا ہے آپ نے میرا۔ بل ٹھیک نہیں بنا۔" وہ مسکراتے اور کہتے تو بھی ٹھیک کروا دیتے ہیں۔ اور بل اکثر میری منشاء کے مطابق بن جاتا۔

وقت بہت آگے لے گیا ہے مجھے۔ آج

جب میں ڈاکٹر صاحب جیسی کرسی پر بیٹھی ایسے ہی کسی مسئلے کا سامنا کرتی ہوں تو دفعتہً وہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حسن سلوک کی لو سے چمکتا کچھ کہتا کچھ سمجھاتا۔

یادوں کی گزرگاہ پر اُن کی ذات سے وابستہ بہت سے روشن چراغ راستہ دکھاتے ہیں۔ ''تنہا'' مشرقی پاکستان پر لکھے جانے والے ناول کا چھپنا عذاب بن گیا تھا۔ سنگ میل مجھے اُن دنوں چھاپتا تھا یکسر انکاری ہوا یہ کہتے ہوئے کہ آپ نے تو سب کی کھلڈی ادھیڑ دی ہے۔ ہمیں جیل نہیں جانا اِسے چھاپ کر۔ فیروز سنز کو بھی اس پر بہت سے اعتراض تھے۔ وہ حساس حصّوں کا یکسر کٹاؤ چاہتے تھے۔ جس کے لیے میں تیار نہ تھی، خون جگر سے لکھی ہوئی کتاب کا فضلہ تو قاری کو نہیں پڑھانا تھا مجھے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب سے چھاپنے کی درخواست کی۔ کتاب چھاپ دی۔۔ شاندار تعارفی تقریب بھی اپنے خرچ پر فلیٹیز میں منعقد کروا کر خالص ادبی دنیا میں میرا داخلہ کروا دیا کہ میرے ملک کے نامور ادیب ڈاکٹر رشید امجد کا یہ جملہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ ''تنہا'' ہی سلمیٰ اعوان کو اردو اب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

یہ تہذیب و شائستگی، شرافت و نجابت، رکھ رکھاؤ والا وضع دار گھرانہ ہے۔ جہاں کارکن فیملی ممبرز کی طرح سمجھے جاتے تھے۔ اور آج بھی ہیں۔ پیچھے لوٹ کر دیکھتی ہوں تو راہداری میں گورے چٹے سانولے سلونے پیارے پیارے بچے چھٹی کے وقت گزرتے یاد آتے ہیں جو اِس وقت میرے بچوں کی عمروں جتنے ہی تھے۔ طیب، زکی، محسن، علی کامران آج بھی یادوں میں جھانکتے ہیں۔ اس وقت یہ کاروباری اور طب کی دنیا کے بڑے نام بن چکے ہیں۔ جتنے بڑے ہیں اتنے ہی مودب اور بہنیے ہیں۔

نظریاتی طور پر آپ اُن سے کتنا بھی اختلاف کریں۔ مارشلاؤں سے تعاون کرنے اور فائدے اٹھانے کا الزام لگائیں۔ مگر یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ انہوں نے صحافت کو نیا رنگ، نیا حسن دیا۔ ان کے ہاں فکری طور پر ایک نسل کی تربیت ہوئی۔ جو پاکستانی صحافت کے افق پر چمکتے دن کی طرح طلوع ہوئی اور ابھی بھی چمک دمک رہی ہے۔ صحافتی زندگی کے پھولوں کے ساتھ اِس راہ کے کانٹے بھی انہوں نے چُنے۔ دونوں بھائیوں نے جیل کی سختیاں بھی جھیلیں۔ مزے کی بات مخالفوں کے ہاتھوں سے بھی اور اُن کے ہاتھوں سے بھی جن سے تعاون کا الزام تھا ان پر۔

☆☆☆☆☆

بارے ''شاہ داستان'' (قسط # 2)

مفروضہ تو یہی ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا۔ صدیوں تک آگ، پانی، ہوا اور مٹی کو مجرد سمجھا گیا۔ کسی کی سوچ مختلف ذرا ہوتی یا کسی پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا تو پوچھ لیا جاتا..... تم کون سی مٹی کے بنے ہو؟ یہ سوال اکثر قلم ہی اُٹھاتے۔ اہلِ قلم اہلِ تشکیک سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں اور سوال اُٹھاتے ہیں۔ مکھی پر مکھی مارتے جانا اُن کا وتیرہ نہیں۔ اُن کی اکثریت اپنے ساتھ لے کر مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاتی ہے۔ نام و نشاں تک باقی نہیں رہتا۔ کچھ خوش نصیب تاریخ میں جگہ پالیتے ہیں مگر تاریخ میں جگہ پانے کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پاپڑ بیلنے کا قصہ الگ ہے۔ کرسی کا سائز انسانی مزاج بدل دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی عوامل کارفرما رہتے ہیں۔ رنگ تصویر کا تاثر اور لفظوں کا چناؤ تحریر کی تاثیر بدل دیتا ہے۔ سرکاری کرسی کا معاملہ عجیب ہے۔ یہ بہت سی مجبوریاں بھی ساتھ باندھے رکھتی۔ جب رہائی ملتی ہے تو؟..... شاہ داستان یہی کہانی ہے۔ اکتوبر ۲۰۱۵ کے 'بیاض' میں شوکت علی شاہ رقم طراز ہیں۔

''اُن دنوں فیض کی قید کا بہت چرچا تھا۔ جیل سے باد صبا درد بھرے پیغامات لاتی..... اہلِ نظر کو یہ سوچ کر شدید اُلجھن ہوتی کہ آخر ایک مقبول عوامی شاعر کو پابندِ سلاسل کر کے حکومت کو کیا حاصل ہو رہا

اسلام عظمی

ہے؟ اس میں اتنا قصور فیض کا نہیں تھا جتنا انگریزی کا تھا۔ ایک شاعر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' گورنمنٹ کالج کا تعلیم یافتہ' انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد محض شاعر رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس زبان کی کچھ اپنی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ امنگیں اور ترنگیں بھی ہوتی ہیں۔ اگر حالات یاوری کرتے تو وہ یقیناً ایک اچھے فارن منسٹر ثابت ہوتے۔ یو این او UNO میں ڈیبیٹ Debate کم اور شیکسپیئر کے ڈرامے زیادہ سنائے جاتے۔"

فراغت کی کرسی پر جھولنا ذرا کھل کر بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس سے آگے وہ لکھتے ہیں۔

"بغاوت کا پلاٹ حقیقی تھا یا فرضی۔ اس نے آنے والے دنوں کی نشان دہی کر دی۔ اس کا سرغنہ بھی ماشاءاللہ سویلین نہیں بلکہ عرشی مخلوق تھا۔ فیض جیسے لوگوں کو تو محض حاشیہ آرائی یا زیب داستان کے لیے رکھا گیا تھا۔ بعض اوقات بلڈی سویلین بھی عزائم کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ بہر حال اس وقت کی اسیری نے ان کی شاعری کو جلا بخشی۔ شہرت کو چار چاند لگائے۔ رہوار خیال سرپٹ دوڑنے لگا۔ عوام نے ان کے لیے دل اور دماغ کے در کھول دیے۔ آج جب وہ زندگی کی قید ہی سے آزاد ہو گئے ہیں تو شاید سوچتے ہوں کہ سودا گھاٹے کا نہیں تھا۔"

افراد اور قوموں کے عروج و زوال کو ان سے بہتر الفاظ میں شاید بیان نہ کیا جا سکتا۔ ایک زمانے میں تیزاب احاطہ کے غلام محمد نامی شخص کا ایک اشتہار اکثر اخبارات میں چھپتا تھا۔ عنوان یہ تھا...... "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

بندہ نہ رہا تو اشتہار چھپنا بھی بند ہو گیا۔ لواحقین اگر تھے تو انھوں نے سوچا ہوگا کہ "مٹی پاؤ"...... پڑھنے اور سوچنے میں کیا رکھا ہے؟ شاہ داستان کی یہ قسط کمال کی ہے۔ تشبیب اور گریز اگرچہ شاعرانہ اصطلاحات ہیں مگر نثر میں بھی در آتی ہیں۔ پٹڑی بدلتے ہوئے شوکت علی شاہ لکھتے ہیں۔

"انشاء اللہ خان اور مرزا عظیم بیگ کا تذکرہ بہت پسند آیا۔ انشاء اللہ خان ایک شرارتی ذہن رکھتے تھے۔ شاعروں کو زچ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان پر انتہائی نامناسب تبصرہ کیا۔ یہ کہنا کہ میر حسن نے مثنوی نہیں لکھی' سانڈے کا تیل بیچا ہے' ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اگر رجز اور رمل کی بحر میں گڈمڈ ہو گئی تھی تو یوں سر بازار عظیم بیگ کو رسوا کرنا نامناسب تھا۔ جواب آں غزل کے طور پر عظیم بیگ چغتائی کو پوری نظم لکھنا پڑی۔ ان کا وہ مشہور شعر ضرب المثل بن گیا:

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

البتہ طیش میں آ کر مرزا ایک حقیقت فراموش کر بیٹھے۔ کیسا ہی شہسوار کیوں نہ ہو گھوڑے سے گرنے سے بڑی پسلی ایک ہو سکتی ہے۔"
شاہ داستان کی یہ قسط ساری کی ساری دلکش ادبی رنگ لیے ہوئے ہے۔ بار بار پڑھنا گراں نہیں گزرتا۔ پطرس بخاری کے بارے بات کرنے سے پہلے "میر حسن نے مثنوی نہیں لکھی' سانڈے کا تیل بیچا ہے"...... کی مناسبت سے ایک بات جو یاد آ گئی ہے لکھے دیتا ہوں۔ حلقہ ارباب غالب میں متعارف ہونے پر۔ جن دوستوں سے ملا اُن کے نام 1983ء میں شائع ہونے والے اپنے پہلے افسانوی مجموعے "جوگ اور سنجوگ" کے دیباچے میں لکھ چکا ہوں۔ اُن دنوں حسن رضوی کے اس شعر کا بہت چرچا تھا۔
میں آگ ہوں اور آگ ہی سے میرا میل ہے
میری رگوں میں خون نہیں مٹی کا تیل ہے

....

اختر کاظمی قدرِ شرارتی تھا۔ شعر کو ذرا تصرف کے ساتھ پڑھتا۔ اس کے کئی شرارتی جملے اور ایک شرارتی نظم مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں تیس سال کے عرصے کے بعد وطن لوٹا تو ایک محفل میں اختر کاظمی کو دیکھا مگر پہچان نہ پایا۔ ڈاڑھی بڑھنے اور عمر ڈھلنے کے ساتھ وہ پہلے والا اختر کاظمی نہیں لگ رہا تھا۔ اُس کے والد اکبر کاظمی کے شعری مجموعے کا دیباچہ مولانا مودودی نے لکھا تھا۔ میں نے اس مجموعے کے بارے میں خالد احمد سے پوچھا کہ شعری مجموعہ کیسا ہے؟
خالد احمد نے مسکرا کر کہا "جو شخص مولانا مودودی سے شعری مجموعے کا دیباچہ لکھواتا ہے اُس کی ادبی حیثیت کا اندازہ تم خود لگا سکتے ہو؟"...... خیر' واپس حسن رضوی کے شعر کی طرف لوٹتے ہیں۔ حسن رضوی کے شعر میں اختر کاظمی کی تحریف یہ تھی:
میں آگ ہوں اور آگ ہی سے میرا میل ہے
میری رگوں میں خون نہیں سانڈے کا تیل ہے

....

اُن دنوں شفیق سلیمی اور عطاالحق قاسمی کے پاس سکوٹر تھے اور حسن رضوی کے پاس کار...... حلقے کے ایک اجلاس کے بعد نسبت روڈ کے ایک ڈھابا ہوٹل پر چائے پیتے ہوئے کسی نے کہا۔
"حسن رضوی کی کار بھلے پرانی ہے مگر مائیلج Milage سو سے اُوپر ہے"......
"نہیں یار' اتنی مائیلج تو نئی گاڑی کی بھی نہیں ہوتی"...... کسی نے لقمہ دیا تو کسی اور نے فنا فٹ درستی کر دی: "مائیلج صرف پٹرول سے گاڑی چلنے سے نہیں بڑھتی' دھکا لگانے سے بھی بڑھتی ہے۔ حسن رضوی کی کار کی زیادہ مائیلج دھکوں کی بدولت ہے۔"
یہ دور ادیبوں کے عروج کا دور تھا۔ شہرت بخاری شاید ایوانِ اقبال کا چیئرمین بنا تو سرکاری گاڑی پر دفتر آنے لگا تھا۔ احمد فراز

ملنے آیا تو کہا:

"شہرت' سرکاری ٹھاٹ باٹھ آنی جانی چیز ہے۔ اپنی سائیکل سنبھال کر رکھنا۔"

میں نے حلقہ ارباب ذوق کا نام سُن رکھا تھا مگر مجھے ادبی حلقوں سے کچھ لینا دینا تب بھی نہ تھا اور اَب بھی نہیں ہے۔ تاہم اخباری خبروں سے حلقوں اور لکھاریوں کے بارے میں آگاہی رہتی ۔ حلقہ ارباب غالب میں آنا جانا شروع کیا تو شفیق سلیمی نے کہا کہ خالد احمد کی چالاکی دیکھو.....

"اپنے حلقہ کا نام "حلقہ ارباب غالب" کا نام رکھ کر "حلقہ ارباب ذوق" کو ہیرو سے زیرو کر دیا ہے"..... یعنی دھیان میرا براہیم ذوق کی طرف چلا جاتا ہے۔ اہلِ قلم میں نوک جوک چلتی رہتی ہے۔ بعد ازاں تیکھے جملوں کا تذکرہ سینہ بہ سینہ سفر کرتا ہے اور آخری سامع کی موت کے بعد سب ختم ..... کھیل ختم پیسا ہضم۔ یادداشتیں تحریر کرنے کا ماجرا یہ ہے کہ لکھنے بیٹھو تو باتیں تحت الشعور سے نکلنے لگتی ہیں۔ محفل پھر سے جم جاتی ہے۔ ماضی کی داستانوں کا آخری جملہ یہ ہوا کرتا تھا.....

باقی رہے نام اللہ کا۔

فنا کو بقا کا محاورہ بھی تھا۔ وقت ایسا تھا کہ کرنے کو بہت نہیں ہوتا تھا۔ رات میں پاک ٹی ہاؤس سب اکٹھے ہو جاتے۔ کوئی اچھا جملہ سرزد ہو جاتا یا اچھا شعر سننے کو مل جاتا تو اُسے جیسے پر لگ جاتے۔ پاک ٹی سے نکلی بات ملک بھر میں پھیل جاتی۔ اب موبائل اور فیس بک کا زمانہ ہے۔ ایسے ایسے شعروں پر ایسی ٹک ٹک رہتی ہے کہ سمجھ نہیں آتی کہ بندہ داد دے کہ ماتم کرے۔ ہر دور بہر حال اپنی روایات تشکیل کرتا ہے۔ سُنی سُنائی اور لکھی لکھائی کا زمانہ گیا۔ سچ یہ ہے کہ اب ٹک ٹک کا زمانہ ہے۔ بات شاہ دا ستان کی ہے تو اُدھر ہی پلٹتے ہیں۔ شوکت علی شاہ پطرس بخاری کے بارے لکھتے ہیں۔

"پطرس کا مزاج سادہ' صاف اور سہل ہے۔ ایسا مزاج جس سے بچے بوڑھے سبھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انھیں بات سے بات پیدا کرنے کا فن آتا ہے۔ کسی مزاحیہ مضمون کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہتے تھے۔ نہ ہی دقیق فلسفیانہ گپھاؤں میں جا کر قاری کے کس بل نکالتے تھے۔ ویسے تو اُن کے سارے مضامین ہی پر لطف ہیں لیکن 'کتے' لکھ کر اس نوع کی اہمیت اور قابلیت کی دھاک بٹھادی۔ عام طور پر کتوں کو ان پڑھ' جاہل' اُجڈ اور گنوار سمجھا جاتا تھا جو ہر وقت ایک دوسرے پر بھونکتے رہتے ہیں اور اکثر بنا اشتعال ہی کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ یہ پطرس تھے جنھوں نے ہمیں بتایا کہ جس چیز کو ہم لڑائی جھگڑا سمجھتے رہے وہ مناظرہ تھا۔ علمی بحث کے دوران اگر رگیں تن جائیں یا منہ سے کف اُڑنے لگے تو اس کا بُرا نہیں منانا چاہیے۔ اُن کی فراہٹ اور غوں غاں کا بھی ہم نے غلط مطلب اخذ کیا۔ یہ

رنگ تغزل تھا۔ اُن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شعر تحت اللفظ نہیں بلکہ ترنم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔"

کچھ ایسے ہی مناظر آج کل ٹی وی کے سیاسی مباحث میں نظر آ جاتے ہیں۔ معاً نظیر اکبر آبادی کا مصرعہ یاد آ جاتا ہے..... روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر..... یا پھر عطاالحق قاسمی کا کالم "کتے" یاد آ جاتا ہے۔ ظالم نے کیا خوب کالم لکھا تھا۔ شوکت علی شاہ پطرس بخاری کے مضمون 'کل سویرے جو مری آنکھ کھلی' کے بارے لکھتے ہیں۔

"اس مضمون سے ہمارے ناپختہ ذہن نے جو تاثر قبول کیا وہ یہ تھا کہ بغیر پڑھائی کے بھی انسان امتحان پاس کر سکتا ہے اور مرحلوں میں ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہم بھی کبھی کورس کی کتابوں سے پورا انصاف نہ کر سکے۔ وہ تو ہندوؤں کی خوش قسمتی تھی کہ بروقت تک نقل مکانی کر گئے تھے نہیں تو کسی برہمچاری کے ہم بھی لکھے لیتے۔"

میرا خیال یہ ہے کہ آج کا قاری لکھے کو اس سنجیدگی سے نہیں لیتا جس سنجیدگی سے لکھاری لکھتا ہے۔ خوبصورت تحریر بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ شوکت علی شاہ ناگفتہ باتیں شگفتہ انداز میں لکھ جاتے ہیں۔

"جوش ملیح آبادی ناگوار حد تک صاف گو تھے۔ زبان دانی کے زعم میں زبان درازی پر بھی اُتر آتے۔ اس زبان درازی نے جہاں انھیں شہرت کے آسمان تک پہنچایا وہاں معاشی اعتبار سے تحت الثریٰ میں بھی دھکیل دیا۔ آخر خیال خاطرِ احباب بھی کوئی چیز ہے۔ لیکن ضمیر جعفری جیسے مرنجان مرنج اور بے ضرر انسان سے حفیظ جالندھری کی چشمک سمجھ سے بالاتر ہے..... شومئی قسمت سے دونوں فوج کے محکمہ ابلاغ عامہ میں بھرتی ہوئے۔ حفیظ صاحب کو کرنل کا ریک ملا جعفری صاحب کپتان کہلائے۔ یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں رہ سکتے ہیں مگر دو شاعر ایک تنگنائے غزل میں نہیں سما سکتے۔ مخالفت مخاصمت میں بدل گئی۔ جنگِ عظیم ختم ہوئی تو دونوں کو بیک جنبشِ قلم فارغ کر دیا گیا۔ جعفری صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی۔ چٹ پر ایک شعر لکھ کر حفیظ صاحب کو بھیج دیا۔ لکھا تھا۔

جرمنی بھی گئی ساتھ جاپانی بھی گئی
تیری کرنیلی بھی گئی' میری کپتانی بھی گئی

.....

آج کے جرنیلی دور میں کرنیلی اور کپتانی دونوں اپنی چمک کھو چکی ہیں۔ بات پراسراریت میں چھپی ہونے کے باوجود بندے بندے کو معلوم ہو جاتی ہے..... آج کی حاضری میں بس یہی ہے۔ اگلی ملاقات بشرط زندگی۔

☆☆☆☆☆

آنگن پر اک نظر

کچھ شخصیات، مقام، کتابیں، اور فیصلے اسقدر تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ وقت کی رفتار اور گزرتی دہائیاں اُن کو دھندلا نہیں سکتیں بلکہ بدلتے دور میں سماجی، سیاسی، مذہبی کلچر کے حوالے سے اُن پر مزید لکھا اور کہا جاتا رہے گا اور یہ اک تاریخی ضرورت بھی ہے۔

ناول "آنگن" ___ بھی ایک ایسا کلاسک ناول ہے کہ جب تک اُردو زبان زندہ ہے یہ اہلِ دانش کے زیرِ مطالعہ باعثِ کشش اور موضوع بحث رہے گا۔

اردو ادب میں ناول۔ ناولٹ اور افسانہ میں جو خواتین برصغیر میں نامور ہوئیں اُن میں قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، عصمت چغتائی، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، واجدہ تبسم، ہاجرہ مسرور، امرتا پریتم اور بیگم امتیاز علی تاج وغیرہ کے نام نمایاں ہیں اور جن خواتین کے ناولوں نے عالمی ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا اُن میں قرۃ العین حیدر کے ناول، ناولٹ اور خدیجہ مستور کا ناول_ "آنگن" قابلِ ذکر ہے۔

خدیجہ مستور نے لکھنے کا آغاز افسانوں سے کیا اور اُن کو شہرت بھی افسانوں سے ملی۔ انھوں نے ایک اور ناول بھی لکھا تھا جس کی چند قسطیں پہلے رسالہ 'نقوش' میں چھپی تھیں خدیجہ مستور کی وفات کے بعد یہ کتابی شکل میں "زمین" کے نام سے ادارہ فروغ اردو نے شائع کیا تھا۔

محمد حنیف

"آنگن" کی اشاعت غالباً 1961 کی ہے اس ناول کو پاکستان میں اردو ادب کا سب سے بڑا ایوارڈ ___ آدم جی ایوارڈ" بھی ملا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے ناول، ناولٹ اور خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" اپنے موضوع اور حسنِ بیان کی وجہ سے اسقدر ہمہ گیر، سماجی تاریخی فکر رکھتے ہیں کہ یہ کسی انعام کے محتاج نہیں بلکہ انعام ان کے نام سے جڑ کر معتبر ہوئے قرۃ العین حیدر کی تحریر فلسفہ تاریخ اور منفرد اسلوب کی وجہ سے قدرے مشکل ہے مگر اس قدر پُرکشش کہ اس کو تیسری چوتھی بار بھی پڑھنا شروع کیا جائے تو غالب کے شعر کی طرح ہر بار لطف و معنی کی توانائی قاری کو محظوظ کرتی ہے۔

خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کے کردار عام زندگی کی طرح چلتے پھرتے بات چیت کرتے اس طرح نظر آتے ہیں کہ پڑھنے والا اُس کی فضا میں تحلیل ہو کر چشم دید بن جاتا ہے۔

"آنگن" ___ میں ہندوستان کی تقسیم سے قبل اور بعد کی سیاسی، معاشی، اخلاقی، گھریلو زندگی اپنی تمام تر خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ آنگن کے کردار ابا، اماں، دادی، چچا، چچی، نجمہ، پھوپھی، جمیل، مجھیا، صفدر بھائی، کسم دیدی، تہمینہ آپا، اسرار میاں، کریمن بوا، شکیل یہ وہ کردار ہیں جو حقیقی زندگی کے کردار ہیں اور یہ کردار قاری کو اپنے سحر میں لے کر چلتے ہیں ان کرداروں کی وفاداری، ایثار، محبت، نفرت، تنگ دستی، خودداری اور روایت پرستی وہ فضا پیدا کرتی ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھیں نم اور دل غمزدہ ہو جاتا ہے۔ جو تحریر دل و دماغ اور چشم کو متاثر کرے اور سچا اور بڑا ادب ہے۔ بوا کریمن کا کردار لاشعوری طور پر اپنے جملوں اور تاثر سے جاگیردار طبقہ اور اس طبقہ کے اردگرد لوگوں کی حیثیت، ذہنیت اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے نور نجمہ پھوپھی جو اپنے خاندان میں پہلی انگریزی تعلیم حاصل کرنے والی خاتون ہے اور ماموں جان جو ایک انگریز، خاتون کا شوہر ہے اور انگریز سرکار کے ملازم ہے۔ اُن کے حوالے سے ہندوستان کی سوسائٹی میں دیسی انگریزوں کی سوچ، رسائی، احتیاط، بود و باش زبان اور اپنے گھروں اور عزیزوں میں اجنبی کی طرح اپنے آپ کو برتر سمجھنا کمال سچائی کے ساتھ اور حقائق کے ساتھ دکھایا ہے۔ آنگن کا انداز بیانیہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے ماضی اور حال ماضی ___ کی روداد ایک رات پر محیط ہے۔

گھر سے بے گھر ہونے تک کا سفر ___ اور حال ___ مستقبل کی طرف رواں دواں

ان کرداروں کو اُن کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ "آنگن" ___ میں

ہندوستان کے مسلمانوں کے کلچر کی پوری تصویر پیش کر دی گئی ہے۔ خاندان کی آپس کی چپقلش بود و باش۔ زبان، رہن سہن۔ احساسِ برتری۔ بدلحاظی۔ رشتہ داری سب تفصیل کے ساتھ ہے۔

"آنگن" ___ کا اختتام بے حد اہمیت کا حامل ہے جو پڑھنے والوں کو روایتی نعرہ بازی کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ صفدر جو انقلابی بن جاتا ہے۔ پہلے تہمینہ کا اور بعد میں چند لمحوں کے لیے عالیہ کا آئیڈل بنتا ہے اس کردار کے بتدریج انجام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انقلابی خواہ بنیاد پرست ہو، قوم پرست ہو یا وطن پرست اگر حکومتِ وقت کے ہاتھوں سے گزرے تو، منصور، وگرنہ اس کا آخری منطقی اور حقیقی انجام اس چیز کے حصول کے لیے ہوتا ہے جو اُس کے پاس نہیں ہوتی مثلاً عزت، دولت، حکومت، عورت وغیرہ۔

ناول میں عالیہ کے حوالے سے یہ سچائی بھی منکشف ہوتی ہے کہ آئیڈل ازم یا شخصیت پرستی انسان کو دکھی بنا دیتی ہے ایسے لوگوں کو انجام کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ سفرِ حیات کھوٹا ہو گیا (اس طرح کا تاثر قرۃ العین حیدر کے ناول "آخرِ شب کے ہمسفر" ___ میں ریحان دا کے حوالے سے بھی ملتا ہے) آنگن میں آزادیٔ ہند کے متوالوں کی جدوجہد کی پوری تاریخ کا عکس ملتا ہے جو لوگ مسلم لیگ یا کانگرس کے جھنڈے تلے ہندوستان کی آزادی کے لیے یا تصور پاکستان میں بے خواب کی تعبیر کے لیے لڑتے گمنام شہید ہوئے ان گمنام شہیدوں کی یادگار آج تک کسی حکومت نے نہیں بنائی۔ شاید اس خوف سے کہ اُن جوانمردوں، اخلاص سے مخمور۔ آزاد فکر سے عبارت نصب العین رکھنے والوں کی یادگار کہیں ان کے افراض، جھوٹ، بدعہدی لوٹ مار، پُرفریب، دوہری زندگی کا فرق واضح نہ کرتی رہے۔ آج کی نسل جو پرمٹ، لائسنس، کلاشنکوف، ہیروین، پلاٹ، بارس ٹریڈنگ، این جی اوز، رشوت، ڈالر، پونڈ، ریال، بیکار اور بے یقینی کے دور میں پروان چڑھ رہی ہے اُن کو کیا پتہ کہ اس آزادی کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔ کس طرح لاکھوں لوگ آزادی کے شوق میں بے نام اور بے آبرو ہو گئے۔ اس صورت حال پر فیض احمد فیض نے کہا تھا:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
سُنا ہے ہو چکا ہے فراق ظلمت و نور
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصال منزل و گام
جگر کی آگ نظر کی اُمنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں

نجات دیدہ و دل کی گھڑی ابھی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

.....

"آنگن" _ میں چھیا اک منہ پھٹ، ضدی، مقابلے پر فوراً آجانے والی لڑکی نظر آتی ہے مگر فطرتاً وہ معصوم اور پختہ کردار کی حامل ہے۔ اگر چھیا کی زندگی کی حقیقتوں کو سامنے رکھا جائے تو اُس کا ضدی اور منہ پھٹ ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ ماں ہے نہیں۔ باپ ایک اور شادی کر کے دوسرے شہر میں آرام کی زندگی گزار رہا ہے اور چھیا کو بڑا بھائی کے گھر چھوڑ جاتا ہے اور پلٹ کر یہ نہیں دیکھتا کہ بیٹی کس حال میں ہے۔ تعلیم، لباس، خوراک اور زندگی کی بنیادی ضرورتیں اُس کو مل رہی ہیں کہ نہیں۔ مادّی ضرورتوں کی اہمیت اپنی جگہ پر لیکن ایک بہت بڑی سماجی سچائی یہ بھی ہے کہ کوئی بھی اولاد ماں باپ کی علیحدگی یا اُن کی (وجہ کوئی بھی ہو) اور شادی برداشت نہیں کر سکتی۔ ماں یا باپ کی اور شادی سے اولاد میں نفرت۔ تشدد، گھٹن، غیر محفوظ ہونے کا احساس بے یقینی اور منفی رویے پیدا ہو جانا فطری امر ہوتا ہے۔ چھیا میں ہم کو انھیں دو صورت کے ردِعمل کی جھلک نظر آتی ہے۔

آنگن میں بڑے چچا کا کردار ایک ایسے شخص کا ہے آزادی کا حصول جن کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے یہ لوگ اس لگن میں اسقدر سچے ہیں کہ حیات کا ایک ایک لمحہ اس پر قربان کر رہے ہوتے ہیں اور اس شوق سفر میں یہ اس حد تک دور چلے جاتے ہیں کہ رشتے ناطے، ذمہ داریاں، صحت، کھانا پینا، من دھن، فرائض، حتیٰ کہ ہنسنا تک بھول جاتے ہیں۔ ایسے دیوانوں کا کنارہ عام طور پر ان کے خاندان کے افراد کو ادا کرنا پڑتا ہے جن کے نصیب میں تنگدستی، خفت، محرومیاں اور اذیت کی لکیر پھر جاتی ہے۔ جیسے گھر والوں کو پولیس کی آمد کا خدشہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ شکیل پہلے گھر سے بھاگ جاتا ہے اور پھر بعد میں چور بن جاتا ہے۔ جمیل کو گھر سے دور اور خوف کے سائے میں کچھ عرصہ کے لیے ملازمت ملتی ہے پھر جلد ہی بیکاری کا دور شروع ہو جاتا ہے بیٹی گاؤں میں خاوند کی بھینسوں کی دیکھ بھال کو مقدر سمجھ لیتی ہے۔ بیوی ہر ایک کا در و ضبط کیے ایک زندہ لاش کی مانند نظر آتی ہے۔ آنگن میں حیا، غیرت، محبت کا باوقار امتزاج تہمینہ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ تہمینہ اپنے پھوپھی زاد صفدر سے جو یتیم ہے اور جس نے پرورش ان کے گھر میں ہی پائی ہے، سے دل کی گہرائیوں سے سچا پیار کرتی ہے۔ تہمینہ کو اپنی محبت کے ساتھ اپنے ماں باپ کی عزت اور اپنی شرم و حیا بھی عزیز ہے تہمینہ کی ماں صفدر کو سخت ناپسند کرتی ہے اور یہ ناپسندیدگی

نفرت کی حد تک ہے۔ باپ کا جھکاؤ صغدر کی طرف ہے، ماں باپ کی پسند اور ناپسند کی وجہ سے گھر میں جھگڑے کی فضا ہر وقت موجود رہتی ہے تہمینہ اس بات کو شعوری طور پر سمجھتی ہے کہ ماں کی مخالفت کی وجہ سے صغدر سے اُس کی شادی ممکن نہیں لہٰذا وہ نوکرانی کی ڈبیا سے افیون چُرا کر کھا لیتی ہے اور اپنی زندگی ختم کر لیتی ہے۔

آج اٹھاون سال کا منظر کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک طرف بیٹی کے سامنے ماں باپ کھڑے ہوتے ہیں دوسری طرف وہ ایک نوجوان کے ساتھ بقول بیٹی کے، جس سے اُس نے شادی کر لی ہے اور جس کا نکاح نامہ اُن کے پاس موجود ہے قاضی صاحب سے درخواست کر رہی ہوتی ہے کہ ان سے (یعنی ماں باپ سے) ہم کو جان کا خطرہ ہے براہ کرم: ہمیں جان کا تحفظ دلایا جائے اور یہ کہ ہماری ذاتی زندگی میں انھیں مداخلت سے باز رکھا جائے۔ ماں باپ کو اولاد کے بارے میں جو چاؤ چاہتیں ہوتی ہیں اُن کے بکھرنے کی اذیت، ماں باپ کا، خاندان اور سوسائٹی میں عزت و وقار اور اُس کے دوسرے بہن بھائیوں کے مستقبل پر کیا کیا اثرات مرتب ہوں گے شاید آج کی مشرقی آزاد خیال اور ترقی پسند لڑکی اپنی نفسانی خواہشات کی چنگاری میں ان احساسات کو بھسم کر چکی ہوتی ہے۔

"آنگن" ___ میں بہت سی باتوں کے علاوہ اُس زمانے کے زمیندار گھرانوں کے معاشرتی مزاج کا پتہ چلتا ہے مثلاً ان کے ہاں ایک خاندانی نوکر اور اک داشتہ کی اولاد کی حیثیت کیا ہے؟

بُوا کریمن جو دادی کی شادی میں جہیز کے ساتھ آئی ہے۔ اسرار جو دادا کی ایک داشتہ کے بطن سے ہے جس کا داخلہ صرف بیٹھک تک ہے۔ دو اقتباس۔

1- کریمن بُوا! بیٹھک سے اسرار میاں کی مری سی آواز آئی۔

کریمن بُوا بیچ میں چیخ پڑی ایک دن چائے نہ پیو گے تو کیا جان نکل جائے گی۔ کریمن بُوا نے اسرار میاں کے حصہ کی چائے نالی میں انڈیل دی۔

2- جب میت اُٹھانے کے لیے مرد اندر آئے تو اسرار میاں سب سے آگے تھے۔ خبردار زندگی میں مالکن نے منہ نہ لگایا اب اُس کی لاش خراب کرنے آئے ہو۔ کریمن بُوا اسرار میاں کے سامنے آ گئیں اور وہ چوروں کی طرح جمیل بھیا کے پیچھے چھپنے لگے۔

آنگن میں خاندان میں سب سے زیادہ احساسات کو چھونے والا کردار بڑی چچی کا ہے، جن کا احترام اور ہمدردی پڑھنے والے کے دل میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ صبر، اخلاص، خدمت، برداشت، استقلال کا

اعلیٰ نمونہ۔ جہاں ایک دردمند ماں ہے تو وہاں مکمل خاوند پرست بیوی بھی ہے جو اپنے عزیزوں کی طنزیہ باتیں سنتی ہی نہیں بلکہ سہتی بھی ہے اور جس کا وجود گھر میں ایک گھنے درخت کی مانند ہے:

دشمن بھی جو چاہے تو میری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہ گزر ہوں
(احمد ندیم قاسمی)

آنگن میں عالیہ کا کردار ایک باشعور بااخلاق جذباتیت سے بلند اک حساس لڑکی کا ہے جو کردار کی عظمت و پاکیزگی اور اصولوں کو آدرش مانتی ہے۔ صغر سے شادی کا فیصلہ اور پھر اسی لمحہ انکار یہ عالیہ کی اسی شخصیت اور فکر کا غماز ہے۔ ناول میں اسی کا کردار مرکزی ہے، جو ماں باپ سے لے کر بڑا کریمن اور بڑے چچا سے لے کر اسرار میاں تک ہر ایک کی تکلیف اپنے دل میں اک کسک کی طرح محسوس کرتی ہے۔

آنگن میں سیاق و سباق سے الگ چھوٹے چھوٹے اقتباس اپنی جگہ اس قدر فلسفیانہ اور جامع ہیں کہ زندگی کے بہت سے رنگ سطروں میں مکمل نظر آتے ہیں: مثلاً

(1) کیا محبت لوگوں کو گونگا بنا دیتی ہے کیا محبت کا نام الفاظ کی موت ہے

(2) جنھوں نے آزادی اور انسان کی فلاح و بہبود کے لیے گولیاں کھائیں..... وہ فن سے خوف بھی محسوس کرتی تھی۔ اُسے یقین تھا ایسے لوگ کسی سے محبت نہیں کرتے۔ یہ لوگ شادیاں کرتے ہیں بچے ہوتے ہیں اور انھیں تباہ کر دیتے ہیں۔ اُن کا اپنا گھر دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ہوتا۔ اماں، بڑی چچی، کسم دیدی، تہمینہ آپا کا انجام اُس کے سامنے تھا۔ (ابا کا جیل سے خط آیا انھوں نے لکھا)

(3) تصور کی دنیا کو کوئی جیل بند نہیں کر سکتی۔ اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ میں نے اپنی ماں کو کندھا دیا تھا۔ قبر میں اُتارا تھا۔ موت بھی زندگی کی اک حقیقت ہے۔

(4) اللہ یہ حکومتیں شہروں کو کیوں نشانہ بناتی ہیں۔ ان کا کیا قصور، انھیں کیوں موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تاریخ کبھی مسکرائے گی کہ نہیں۔ ایک ایک لفظ خون کی بوند معلوم ہوتا ہے کیا پتہ اُس وقت بھی بچے جاپانی گڑیاں خریدنے کسی دکان پر کھڑے ہوں اور اس وقت اچانک خوفناک بم کا دھماکہ ہو جائے۔ اور۔

(5) جس طرح انسان کو سمجھنا مشکل ہے اسی طرح یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان کا فعل اس کے خیالی سے جدا کیوں ہو جاتا ہے۔

(6) جی ہاں عورت اگر کٹھ پتلی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو ظاہر ہے دماغی فتور سمجھا جائے گا۔ مرد عورت کو بے وقوف دیکھ کر ہی سچی خوشی محسوس کرتا ہے۔

(7) زمانے زمانے کی بات ہے جب ہندو اپنے گاؤں کے کسی مسلمان پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان اُن پر نچھاور کر دیتے۔

ہم اس آخری اقتباس کی روشنی میں اگر آج کے پاکستان میں رہنے والوں کو جن کی 95% آبادی مسلمان ہے کے آپس کے سلوک کو دیکھیں تو خوف آتا ہے۔

مفاد پرست تاجروں، ملاؤں، مصلحت کیش ججوں اقتدار پرست جرنیلوں، جاگیرداروں، پیشہ ور سیاستدانوں۔ ابن الوقت مشائخ نے حصول اقتدار کے لیے مسلمانوں کو آپس میں لسانی، صوبائی، مذہبی فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں دھکیل دیا ہے آزادی فکر، جمہوری حق۔ باہم محبت ایک دوسرے کا اعتبار عنقا ہو گیا ہے:

کرے کوئی تیغ کا نظارہ اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

.....

عام زندگی میں اور تاریخ کے اوراق میں بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آدمی کی بعض خواہشات اس قدر شدید ہوتی ہیں کہ رسم و رواج روایت اخلاقی مذہبی قانونی پابندیوں کو یہ خواہش ذہن سے محو کر دیتی ہے۔

آنگن میں اس جذبہ کو بہت سادہ لیکن پوری گہرائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شمی کے خط کی یہ تحریر پڑھیے جو وہ عالیہ کو لکھتی ہے ——اور وہ (جمیل) میری بیٹی سے پوچھنے لگے کہ میں تیرا باپ بن جاؤں؟ پھر مجھ سے بولے کہ شمی تمہاری محبت مجھ پہ قرض ہے——

بجیا آپ کو ایک بات بتاؤں جب بیٹا ہوئی تھی تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ جمیل کی بیٹی نہیں ہے۔

اس جذبہ کی شدت اور جنونیت کا اظہار امرتا پریتم" نے بھی "رسیدی ٹکٹ" میں کیا ہے جو اُس کی سوانح ہے

1960 میں جب میں بمبئی گئی تو اُن دنوں راجندر سنگھ بیدی نے پوچھا پرکاش پنڈت سے ایک بات سُنی تھی کہ "نوراج" ساحر کا بیٹا ہے اُسی شام میں نے بیدی کو اپنی اُس عالم دوانگی کی بات سنائی —— کہ یہ تخیل کا سچ ہے حقیقت کا سچ نہیں ہے اور تخیل کا سچ جھوٹا نہیں ہوتا۔

خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کا مجموعی تاثر محرومیت کا ہے لیکن شمی کا خط جو وہ ہندوستان سے پاکستان گئی عالیہ کو لکھتی ہے۔ اُمید خوشی درخشاں مستقبل کے چراغ روشن کرتا ہے۔

پیاری بجیا تسلیم.....

بجیا کاش آپ یہاں ہوتیں تو دیکھتیں کہ میں کتنی خوش ہوں.....

آپ کے جمیل بھیا نے مجھے اپنا لیا ہے—— اب میں بہت خوش ہوں۔ بجیا جمیل میری

بہت فکر رکھتے ہیں۔ میری بٹیا کو بھی بہت چاہتے ہیں...... کریمن بُوا بھی بہت خوش ہیں۔ کہتی ہیں اپنا خون اپنوں میں آ گیا ہر دم بٹیا کو لپٹائے پھرتی ہیں......

اب گھر کی بڑی اچھی حالت ہے۔

آپ کی پیاری
جھمی

''آنگن'' میں بیانیہ کردار عالیہ کا ہے۔ عالیہ اِک حساس لڑکی ہے جو انسانی رشتوں کو محبت اور اخلاص سے جوڑ کر دیکھتی ہے عالیہ نہ نظریاتی ہے نہ سیاسی اس کو قطعاً پسند نہیں سیاست، مذہب وطن آزادی کے نام پر خاندان کی معاشی تہذیبی اساس تباہ کر دی جائے اور خونی رشتے اختلاف سے آپس میں غصہ نفرت کی آگ میں جلتے رہیں۔

''بڑے چچا آپ کو کیا مل گیا یہ سب کر کے یہ جو آپ نے ملک کا جوگ سادھ لیا ہے تو تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کیا ہوا ہے۔''

جب پاکستان بن جاتا ہے عالیہ امی کے ساتھ پاکستان آ جاتی ہے۔ بیورو کریٹ ماموں چار کنال کی شاندار ضروریات زندگی کے سامان سے بھری کوٹھی الاٹ کروا دیتے ہیں۔

عالیہ وقت گزاری کے لیے مہاجر کیمپ جانا شروع کرتی ہے وہاں ایک اُبھرتے کامیاب نوجوان ڈاکٹر سے آشنائی ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر عالیہ کو شادی کا پیغام دیتا ہے اور شاندار مستقبل خوش و خرم زندگی کی یقین دہانی کرواتا ہے۔

صفدر جو عالیہ کی پھوپھو کا بیٹا ہے ایک مدت کے بعد گھر کے قریب ملتا ہے عالیہ صفدر کو گھر لے آتی ہے صفدر کے حالات سُن کر عالیہ کو اس سے ہمدردی ہوتی ہے اور صفدر سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ فیصلہ وہ اپنی امی کو بھی بتاتی ہے۔ صفدر ممانی کو یقین دلاتا ہے وہ اب سیاست اور پارٹی بازی سب چھوڑ دے گا۔

پرمٹ لائسنس حاصل کر کے جائیداد گاڑی بینک بیلنس سب کو یقینی بنائے گا۔

عالیہ اپنی سوچوں میں ایک سیدھی سادی مسکراہٹوں سے مہکتی خوشحال فیملی کا تصور رکھتی ہے لیکن کیوں؟

ڈاکٹر اور صفدر کو جو شاندار محفوظ مضبوط رشتوں سے استوار فیملی کی بات کرتے ہیں شادی سے انکار کر دیتی ہے۔

کیا؟ گھر میں ماں باپ کی اختلافی زندگی کی گھٹن اور بڑے چچا کے گھر کے حالات جہاں نظریاتی اور سیاسی تناؤ سے رشتے متصادم نظر آتے ہیں اور تلخ طنزیہ دل خراش گفتگو یہ سب حساس دل عالیہ سے سوچنے کی صلاحیت اور فیصلہ کی قوت چھین لیتے ہیں۔ کنفیوژڈ، منزل و مقصد زدہ جھمی اس کے سینے سے دھم دھم کرتی گزر گئی۔

میں نے آپ کو ہرا دیا بجیا

☆☆☆☆☆

دیر آید، درست آید

باؤلی میں شامل شازیہ مفتی کی تحریر کردہ کہانیوں کو پڑھنے کے بعد بجا طور پر کہا جاسکتا ہے: 'دیر آید، درست آید' !!

اس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ دیکھ کر میرا تیقن اس بات پر اور بھی پختہ ہو گیا ہے کہ اس کے اندر ایک تخلیق کار چھپا بیٹھا تھا جسے اس نے دریافت کیا۔ اس تخلیق کار کی موجودگی کا شازیہ مفتی کو تو علم تھا مگر اس کے گرد و پیش میں سے کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا۔ یہ کہانیاں ایسی ہیں جو شازیہ مفتی نے ہی لکھنا تھی اور انہیں لفظی پیکر عطا کرنے کے لیے اسے انتظار کی مشقت کھینچنا تھی۔ کہانی لکھنے کے لیے زندگی کا ذاتی تجربہ لازمی قرار پاتا ہے۔ اگر آپ نے دوسروں کی کہانیاں اور افسانے پڑھ کر جگالی کرنی ہے تو تخلیقی اثاثہ ویسی ہی صورت حال سے دوچار ہوگا جیسے ہمارے ہاں شاعروں کے ساتھ ہوا ہے؛ اوپر سے نام ہٹا دیں تو معلوم ہی نہیں پڑتا کہ غزل کس کی ہے؟ شازیہ مفتی کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ کہانی کہنے کا انداز، اسلوب اور موضوعات ایسے ہیں کہ جن کے تناظر میں شازیہ مفتی کی الگ شناخت بنتی نظر آتی ہے۔ کہانیوں کے دوسرے مجموعے میں اپنی شناخت بنانے میں کہانی کار اگر کامیاب ہو جائے تو یہ یقیناً غیر معمولی کام قرار پاتا ہے۔

شازیہ مفتی کی کہانیاں پڑھتے ہوئے میں اپنے سامنے یہ سوال رکھتا ہوں کہ اس کا فوکس کیا ہے اور وہ کس بات کا اظہار اپنی کہانیوں میں کرنا چاہتی ہے؟ اپنے سوال کا واضح طور پر مجھے یہ جواب ملتا ہے کہ اپنے اردگرد کی زندگی کے تناظر کو جب وہ کرداروں کے ساتھ مربوط کرتی ہے تو اس کے ہاں کہانی جنم لیتی ہے۔ ہمارے ہاں کہانی کاروں کا المیہ یہ رہا ہے کہ وہ شعوری رو کے تحت وہ

غافر شہزاد

سب کچھ لکھتے چلے آئے ہیں جو انہوں نے انفرادی اور ذاتی طور پر محسوس کیا، جس کا تجزیہ کیا۔ ایسے کہانی کاروں کے کردار اپنی شناخت یہاں تک گم کر دیتے ہیں کہ ان کا نام بھی رکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مگر شازیہ مفتی کی کہانیوں کے کردار بے نام اور بے شناخت نہیں ہیں، وہ روزمرہ زندگی کے چلتے پھرتے، توانا اور زندہ کردار ہیں۔

شازیہ مفتی کو جب کوئی کردار اپنی گرفت میں لیتا ہے، وہ اس کے اردگرد کہانی کا ریشم بنتی ہے اور اس کہانی کو تشکیل دینے میں ایک منظر نامہ ترتیب دیتی ہے۔ یہ منظر نامہ کردار اور کہانی کے ساتھ یوں ہم آمیخت ہو جاتا ہے کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کردار پہلے وجود میں آیا یا کہانی کا منظر نامہ۔ اسی طرح اس کی کئی کہانیوں میں منظر نامہ پہلے ترتیب پاتا ہے اور پھر وہ ماہر کھلاڑی کی طرح، مہروں کی جگہ انسانوں کو شطرنج کے خانوں میں رکھتی ہے جس سے ایک کہانی ترتیب پا جاتی ہے۔ کہانی کسی بھی صورت حال سے وجود میں آئے، شازیہ مفتی کی زبان اپنے اندر ایک ایسی توانائی اور ڈائنامکس رکھتی ہے کہ پڑھنے والے کو ان کہانیوں میں پیش کی گئی زندگی متحرک اور تناور دکھائی پڑتی ہے۔ یہ کہانیاں پڑھ کر قاری کسی نامعلوم یاسیت کے سمندر میں نہیں ڈوبتا۔ اگر کوئی المیہ بھی بیان کرے تو اُسے زندگی کا ایک قابلِ قبول رخ بنا کر پیش کرنے میں اُسے ملکہ حاصل ہے۔ ان کہانیوں میں اکثر ایک تیکھے طنز کو استعمال کیا گیا ہے جو پڑھنے والے کو اس سماجی رویے، غیر انسانی کرداری صفت یا تلخی و تندی کا احساس دلاتا ہے، جس کے سبب کہانی سپاٹ ہونے سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اس کے اندر نفسیاتی تہہ داری بھی آ جاتی ہے۔

شازیہ مفتی کی یہ کہانیاں جو "باؤلی" کے نام سے اشاعت پذیر ہو رہی ہیں، فیس بک پر کچھ عرصہ سے پیش کی جاتی رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ کہانیاں تو میں پہلے بھی پڑھ چکا تھا، باقی اب پڑھی ہیں تو اندازہ ہوا ہے کہ فیس بک کی وال پر براہ راست لکھنے والی شازیہ مفتی نے الگ قسم کا تخلیقی تجربہ کیا ہے۔ اسے کہانی لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم کی ضرورت نہیں، موبائل فون ہی کافی ہے۔ گویا شازیہ مفتی نے اس پرانے بیانیے کو بھی بل ڈوز کر دیا ہے کہ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ فکشن لکھنے کے لیے ایک خاص ماحول، قلم اور کاغذ اور ایک مخصوص قسم کی نشست درکار ہوتی ہے۔ شازیہ مفتی سے اردو کہانی کا کینوس بجا طور پر توقعات وابستہ کر سکتا ہے، اس کی کہانیوں کے نقوش الگ اور منفرد ہیں جو اپنی پہچان بناتے ہیں۔ اس کے قلم کا بہاؤ اور تخلیقی وفور اس سے کہیں زیادہ لکھوائے گا۔

☆☆☆☆☆

عمران نقوی سے آخری ملاقات

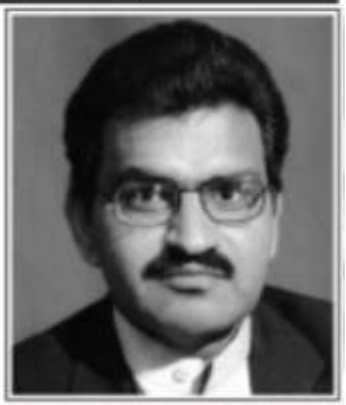

عمران نقوی سے میرا محض تعلق نہ تھا بلکہ تعلقات کا ایک سلسلہ تھا: ان مول اخلاص کی ایک طلائی زنجیر کی طرح کڑی کڑی مربوط، آگے بڑھتا ہوا سلسلہ جس سے سیّد یزدانی جالندھری بھی منسلک تھے اور سیّد آفتاب نقوی بھی۔ محبت اور ارادت کی ان کڑیوں پر غور کرتے ہوئے کب عمران اور میں اپنے اندر موجود دوستی کے باہم جذبے سے متعارف ہوئے مجھے یاد نہیں۔ عمران عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا لیکن یقین جانئے اس سے پہلی ملاقات کی فراموشی میں میری ڈھلتی عمر کا کچھ دخل نہیں۔ سارا قصور عمران نقوی کی اس سیدھی سادی طبیعت اور محبت بھرے مزاج کا ہے کہ ذہن پر زور دینے پر بھی ابتدائی ملاقات کا واقعہ یاد نہیں آتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہماری پہلی ملاقات ہوئی ہی نہ ہو۔ ہم بس بیچ میں کہیں بس مل گئے ہوں۔ وہ اسی طرح گھل مل جاتا تھا، دودھ میں مٹھاس یا محاورے کی زبان میں شیر و شکر کی طرح۔ اب الگ کر کے دیکھیں تو بھلا کیونکر؟ وہ کب دوستوں سے متعارف ہوا اور ان کی ذاتی اور ادبی زندگیوں کا حصہ بن گیا شاید کسی کو بھی یاد نہ ہو۔ اجنبیت ختم کرنے کا وصف ضرور اس کی گھٹی میں تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہمارے ساتھ ہے اور بس وہ تھا۔۔۔ ایک دل کش احساس کی طرح، ایک مہکتے جھونکے کی طرح، اطراف احساس اور

حامد یزدانی

اکنافِ فکر کو مشامِ جاں کی طرح معطر کرتا ہوا --- اپنی دل نواز باتوں سے، اپنے فکر انگیز شعروں سے اور اپنی مسحور کن آواز سے۔

شاہدرہ میں مقیم ایک علم پرور سادات خانوادے میں آنکھ کھولنے والے عمران نقوی کا لاہور کے ادبی منظر نامے میں ظہور پنجابی ادبی پروار کے اجلاسوں کے افق پر ہوا جہاں وہ پروفیسر یونس احقر کے پہلو میں بیٹھا تو میر لنچ ہوم میں منعقدہ ہفتہ وار تنقیدی اجلاس کی کارروائی کچھ اس انہماک سے لکھ رہا ہوتا تھا کہ کبھی کبھی اس کے وجود کا احساس بھی حاضرین کو نہ ہو پاتا۔ کم گو یا یوں کہہ لیجیے کم لحاظ گو تھا مگر جب اور جو بات کرتا تھا سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اس کی ادبی سرگرمیاں پنجابی ادبی پروار تک محدود نہ تھیں - ہماری ملاقاتیں پاک ٹی ہاؤس میں حلقۂ اربابِ ذوق کے اجلاسوں میں بھی ہوتیں اور پرنس ریستوران میں حلقۂ تصنیفِ ادب کی نشستوں میں بھی۔ شہر بھر میں ہونے والے مشاعروں میں بھی اور ریڈیو پاکستان لاہور کے ادبی پروگراموں میں بھی جہاں ہمیں احمد ندیم قاسمی، حفیظ تائب، منیر نیازی، اشفاق احمد، عارف عبدالمتین، ڈاکٹر خورشید رضوی، طفیل ہوشیار پوری، ذوقی مظفر نگری، علیم ناصری، انجم رومانی، انتظار حسین، شہزاد احمد، اختر حسین جعفری، انیس ناگی، ناصر زیدی، خالد احمد، نجیب احمد، سراج منیر، احمد عقیل روبی، امجد اسلام امجد، اسرار زیدی، عطا الحق قاسمی، سعادت سعید، تحسین فراقی، حفیظ الرحمن احسن، خالد بزمی، جعفر بلوچ، رشید کامل، سلیم کاشر، منظور وزیرآبادی، خالد شفیق، ایوب خاور، محمد سلیم طاہر، علی اکبر عباس، اسلام شاہ، حسن رضوی، زاہد مسعود، عباس نجمی، علی اصغر عباس، خالد علیم، عباس تابش، محیط اسماعیل، اعجاز رضوی، اصغر عابد، طارق کامران، ضیاالحسن، امجد طفیل، طاہر اسلم گورا، یونس بٹ، غضنفر علی ندیم اور کتنے ہی اور نامور اور نوجوان لکھاریوں کی خلوص آگیں قربت نصیب ہوتی۔

لاہور ریڈیو پر اس کے تعارف کا اعزاز مجھے یوں حاصل ہوا کہ پروگرام پروڈیوسر ارشاد حسین جو راولپنڈی سے تبدیل ہو کر نئے نئے لاہور تعینات ہوئے تھے اور جو دیکھتے ہی دیکھتے ہم سب کے ارشاد بھائی بن گئے تھے، ریڈیو پاکستان لاہور میں ان کا دفتر فنون، محفل، تخلیق، ماہِ نو اور فانوس جیسے موقر جرائد کے دفاتر کی طرح ایک ادبی مرکز سا بن گیا تھا جہاں شہر بھر کے شعرا اور ادبا کا

جگمگاتا رہتا۔ یہیں عمران ان سے متعارف ہوا۔ ارشاد بھائی نے جیسے آواز کی دنیا میں آنے کے لیے پہلے میری حوصلہ افزائی کی تھی اور ریڈیو کی مستقل آواز اور سکرپٹ رائٹر بننے میں رہنمائی کی تھی اسی طرح انہوں نے عمران کا ہاتھ بھی تھام لیا اور وہ مرے ساتھ پروگرام "دانش کدہ" میں اپنی آواز کے جوہر دکھانے لگا۔ پھر ہم دونوں نے مختلف اور متعدد معیاری پروگرام لکھے بھی اور ان میں صداکاری بھی کی۔ پروگرام سے فارغ ہو کر ہم اکثر مل کر چائے نوشی کرتے جس کے دوران میں گھر کی باتیں، روزگار کی باتیں، ادب کی باتیں، گھمبیر باتیں اور ہلکی پھلکی گفتگو بھی کچھ ہوتا۔

پھر میرا سوشیالوجی میں ایم اے مکمل ہو گیا اور لیکچررشپ کا آغاز ہو گیا مگر لاہور ریڈیو سے میں بدستور وابستہ رہا جب تک کہ وائس آف جرمنی کی اردو نشریات میں ایڈیٹر، پروڈیوسر مقرر ہو کر کولون نہیں چلا گیا۔ عمران نوائے وقت سے منسلک ہو گیا جہاں اس نے بالخصوص ادبی صفحے کے لیے ان تھک کام کیا اور ایسے اہم علمی ادبی انٹرویوز کیے کہ "حرف ملاقات" اور "شرف ملاقات" اب تک ان کی گواہ ہیں۔

عمران نقوی سرتاپا ایک پیارا آدمی تھا۔ شفاف کردار کا حامل بھلا مانس جو زبانی طور پر ہی نہیں عملی طور پر بھی دوستوں میں خوشیاں بانٹتا تھا۔ جس سے ملتا محبت سے ملتا۔ کبھی کسی کا گلہ نہ کرتا۔ ہر ملنے آنے والے کا استقبال ایک مسکراہٹ سے کرتا اور حتی الوسع خاطر تواضع کرتا۔ قریبی دوستوں کی پھبتیوں کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہتا اور بلا جھجک ان کے قہقہے میں بھی شامل ہو جاتا۔ بڑوں کا احترام، دوستوں سے محبت اور ادب سے لگاؤ اس کے خاندان کی روایات رہی ہیں اور وہ انہیں خوب نبھاتا تھا۔ حفیظ تائب پر "اک شخص مہکتی چھاؤں سا" اور "ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی پر "دلیل آفتاب" اس مؤدب رویے کے اظہار کی محض دو روشن مثالیں ہیں ورنہ اس نے کتابیں تو اور بھی لکھیں اور مرتب کیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تخلیقی خطے میں یوں تو اس نے نظموں اور غزلوں کے رنگین موسم بھی چکھے مگر اس کی طبیعت کو مرغوب بہار نعت ہی تھی اور وہ اسی بہار کی خوشبو سے سرشار رہنا چاہتا تھا:

دل میں ہے صلِ علیٰ کا موسم
اور سانسوں میں ہے جاری خوشبو

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی

دیگر اردو اور پنجابی شاعری دل پذیر نہیں۔ "خیمۂ شام" اور "گل دی گل اے" میں شامل اس کی شاعری ہی کو دیکھیے۔ عمدہ مضامین اور دل کش اسلوب کی مثالیں جا بجا بکھری ملیں گی۔ وہ متانت اور وقار جو اس کی شخصیت کا خاصا تھے اس کے اشعار میں سے بھی صاف جھلکتے ہیں۔ متنوع بحور میں، سیدھے سبھاؤ میں دل کو مہکانے والے اور سوچ کو چکانے والے ایسے اشعار کی تعداد اس کے ہاں بہت زیادہ ہے جو اس کو نہ صرف ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے بلکہ اساتذہ کے دل کے بھی قریب کرتی ہے۔ اس کے مجموعہ ہائے کلام پر سینئر ناقدین کی تحسینی آرا کیا حوالے کے لیے کافی نہ ہوں گی جن کی روشنی میں عمران نقوی کے اشعار کا حسن اور بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

اُسے گنوا تو دیا ہم نے ایک لمحے میں\
پھر اس کے بعد بہت دیر تک اداس رہے

جب صدیاں بے نور ہوئیں\
روشن تھا اس لمحے کون\
دریاؤں کے گہرے دکھ\
دریاؤں میں اترے کون

کہانی کے سبھی کردار مجھ میں بولتے ہیں\
کہانی میں مرا کردار کیا ہے، دیکھنا ہے

عجب اک شہرِ گویائی ہے جس میں\
ملا ہے جو بھی لب بستہ ملا ہے\
اُدھر اک پیاس مشکیزے پہ اتری\
اِدھر تاریخ کو سجدہ ملا ہے

مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا کر لیا ہم نے\
ستارے ہمسفر تھے، راستے کرب و بلا ٹھہرے

اظہار کی یہی شفافیت اور خیالات کی یہی پاکیزگی ہے جو نعت کی شاداب مگر پُر خطر وادی میں اُس کے سفر کو آسان بناتی ہے۔ نعتِ نبیؐ کے نازک مرحلے سے کام یاب و کامران گزر جانا معمولی کام نہیں۔ ادب و احترام کے غیر معمولی تقاضوں کے پیشِ نظر اساتذہ نئے آنے والوں کو ہمیشہ محتاط بلکہ دم بخود رہنے کا مشورہ دیتے رہے ہیں کہ نعت کہنا دو دھاری تلوار پہ چلنے کے مترادف ہے۔ اتنی پابندیوں اور احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعلیٰ شعر کہنا کوئی کار آساں نہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں "وجب الشکر علینا" میں عمران نقوی نے کیسے کیسے خوب صورت نعتیہ اشعار کہے ہیں:

پھول مدحت کے کھلائے شب بھر
صبح شاخوں سے اتاری خوشبو

....

پھر آج نعتِ نبیؐ کا ہوا دیا روشن
دیارِ جاں سے گزرنے لگی ہوا روشن

....

ہو گنبدِ خضرا سے نمو کشتِ سخن کی
یہ سبز حوالہ مری تقدیر میں لکھ دے

....

مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ نے بھی بھرپور شعریت اور جذبے کے وفور کے توازن سے معمور ان اشعار میں عمران کی ہنرکاری اور عقیدت مندی دونوں کا لطف لیا ہوگا۔ میرا یہ یقین دراصل ڈاکٹر خورشید رضوی کی فراہم کردہ بنیاد پر استوار ہے جو کہتے ہیں: ''نسبت کی قوت اور جذبے کا وفور عمران سے نعت کہلواتا ہے۔ یہ وفور اس کے ہاں کس حد تک زور کرتا ہے اس کا کچھ اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس مجموعے میں شامل نوے فی صد نعتیں پے بہ پے بہ صرف تین ماہ کی مدت میں وارد ہوئیں اور اہلِ ذوق دیکھ سکتے ہیں کہ یہ مشقِ سخن سے نہیں نقشِ احساس سے عبارت ہیں۔'' آیئے عمران کی نعت پر ڈاکٹر تحسین فراقی کی رائے بھی دیکھتے چلیں جن کا کہنا ہے کہ ''(عمران نے) گہری باتیں تازہ اسلوب اور اور اعلیٰ ہنرمندی کے امتزاج سے کی ہیں---- ندرتِ اظہار اور اچھوتے اسلوب کے جابجا تیوروں نے اس مجموعۂ نعت کو نعت کے روایتی مجموعوں سے الگ پہچان بخشی ہے۔''

نعت تو چلیے عقیدت کی گویا معراج ٹھہری مگر ہم دیکھتے ہیں روایتی اور عامیانہ عاشقانہ مضامین اور انسانی اور اخلاقی معیار سے رگرے ہوئے رویوں سے ہمارے دوست کی غزلیہ شاعری بھی پاک اور محفوظ ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عارضی زندگی کے اس ریلے کے اتر جانے کی حقیقت وہ بہت پہلے جان چکا تھا۔ وہ ایک حساس فن کار کی طرح آتی جاتی سانسوں اور روح کی باہم کش مکش سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔ اسی لیے اس کا اظہاریہ اپنے بطن میں ایک ایسی گہری تڑپ چھپائے ہوئے ہے جو خود میں سوال بھی ہے اور جواب بھی:

خورے کیہی تے کیہ نیں سی---ملی نہ کدھروں سار
ساہواں مینوں جیوندا رکھیا---روح نے دتا مار

....

اور پھر وہ تخلیقی تجسس اور دوسرے کنارے کا کھوج بھی تو اس کے لاشعور کی پہنائیوں

میں سرگرداں تھا جو ہر سوچنے والے ذہن کی متاع بھی ہے اور اس کا روگ بھی:

پسِ آئینۂ اظہار کیا ہے ، دیکھنا ہے
ترے دریاؤں کے اُس پار کیا ہے، دیکھنا ہے
متاعِ جاں تو تیری ضد کے آگے ہار آئے زمانے! اب ترا اصرار کیا ہے، دیکھنا ہے

.....

زندگی کی خواہشوں اور زمانے کے تقاضوں کا سلسلہ تو ناختم ہے۔ یہ بات جاننا عمران جیسے صاحبِ فراست مسلمان اور زیرک انسان کے لیے مشکل نہ تھا۔ اور پھر جب اُس پر یہ ازلی ابدی حقیقت آشکار ہوگئی کہ دنیا کی اِس فانی زندگی کی موجوں پر رواں دواں مستعار سانسوں کی کشتی کو ایک نہ ایک دن ساحل آشنا ہونا ہے تو اُس کے وژوں میں جگمگاتی ایمانی ضو نے اُس کا رُخ اُس پاکیزہ ہستی کی طرف موڑ دیا جو دائم و باقی رب کی محبوب بھی ہے اور شافعِ محشر بھی۔ سو، اُس نے باقی رہنے کا سُراغ پالیا اور دائم و باقی رب کے محبوب کی مدح کی ناؤ پر ہولیا اور سحاب رحمت کے سائے میں پناہ گیر ہو گیا۔ اسی لیے تو وہ نہایت اعتماد سے اعلان کر رہا ہے کہ:

اُنؐ کی رحمت سے ہوں میں اہلِ بقا میں ورنہ
چار سُو پھیلا ہوا رنگِ فنا دیکھتا ہوں

جس انسان کو اہلِ بقا کا قرب حاصل ہو جائے اُسے اور کیا چاہیے! یوں اسے عارضی خواہشوں کے پار سدا جینے کا راستہ مل گیا تھا:

یہ جو اک راہ مدینے کی طرف جاتی ہے
زندگی اصل میں جینے کی طرف جاتی ہے

.....

اپنے ممدوحِ مکرم، شفیعِ معظم، شاہِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پروانۂ شفاعت کی ضمانت لے کر وہ تو عازمِ محفلِ بقا ہوا اور ساحلِ ابد کی جھلمل جھلمل روشنیوں میں نہا گیا اور میں یہاں بدلتے موسموں کے لرزاں لرزاں پردوں کے اِس پار کھڑا ابھی یہی سوچ رہا ہوں کہ عمران مجھے پہلی بار کب اور کہاں ملا تھا۔ لیکن یقین جانیے اس سے پہلی ملاقات کی فراموشی میں میری ڈھلتی عمر کا کچھ دخل نہیں سارا قصور عمران نقوی کی اس سیدھی سادی طبیعت اور محبت بھرے مزاج کا ہے کہ ذہن پر زور دینے پر بھی ابتدائی ملاقات کا واقعہ یاد نہیں آتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہماری پہلی ملاقات ہوئی ہی نہ ہو--- اور --- اور آخری ملاقات؟ --- آخری ملاقات!؟--- جب دوستی کی اخیر نہیں تو، عزیزانِ من! آخری ملاقات کیسی---!

☆☆☆☆☆

ناصر کاظمی کی شاعری کا عروضی تجزیہ

ہر شاعر اپنے داخلی حالات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے خارجی حالات کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ آج ہم کسی بڑے شاعر سے بھی ہجرت کا موضوع بیان کرنے کا ذکر کریں تو شاید وہ اس طرح بیان نہیں کر پائے گا جیسے ناصر کاظمی نے بیان کیا ہے۔ اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آج حالات بدل گئے ہیں، ماحول بدل گیا ہے، وقت بدل گیا ہے۔ کوئی چاہے کتنا بڑا شاعر یا مصور ہو، دوسروں کو کیسے وہ یہ منظر دکھا سکتا ہے جو اُس نے خود نہیں دیکھے۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں دو بڑے موضوع محبت اور ہجرت کا ذکر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ مناظر بیان کرنے کے لیے کیسے سروں، راگوں اور کس مزاج کی بحور و اوزان کا انتخاب کیا ہے۔

بشیر رزمی لکھتے ہیں۔ ”میں نے چند (مرحوم) شعرائے کرام کا عروضی تجزیہ کیا ہے۔ اس کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں .....

نمبر شمار	اسمائے شعرائے کرام تعداد	اوزان
۲۶	ناصر کاظمی	۳۱ ”(۱)

ناہید قاسمی نے ناصر کاظمی کی غزلیات کے اوزان چونتیس بتائے ہیں:-

”یوں ثابت ہوا کہ ناصر نے تقریباً 34 مختلف لہجے اپنائے۔ ان میں چھوٹی بحروں کی تعداد بہت ہے لیکن ناصر نے لمبی بحریں بھی استعمال کیں اور ان میں اچھی غزلیں کہیں۔ یہی لہجوں کا تنوع ہے کہ ناصر کی غزلوں کو ظاہر میں بھی پر کشش بنائے رکھتا ہے۔“ (۲)

ارشد محمود ناشاد لکھتے ہیں:-

”ناصر کاظمی کے ہاں اوزان و بحور کا تنوع اُردو میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو غزل کے لیے مجموعی طور پر سو سے زیادہ اوزان برتے گئے ہیں مگر کسی شاعر کے ہاں انفرادی سطح پر اوزان کی تعداد تیس سے متجاوز نہیں ہوتی۔ خدائے سخن میر نے کل چھبیس (۲۶) اوزان میں شعر کہے ہیں۔ غزل کے لیے غالب نے انیس (۱۹) فانی بدایونی نے تیس (۳۰) اور حفیظ ہوشیار پوری نے اُنتیس (۲۹) اوزان استعمال کیے ہیں۔ ناصر کے ہاں اوزان کی تعداد سینتیس (۳۷) ہے۔“ (۳)

ناصر کاظمی کے اوزان کی تعداد بشیر رزمی نے ۳۱، ڈاکٹر ناہید قاسمی نے ۳۴، اور ارشد محمود ناشاد نے ۳۷ بتائی ہے، مگر میرے تجزیے

وجاہت تبسم

میں نظموں کے اوزان بھی شامل ہیں اور مجھے ناصر کاظمی کے کلیات میں (۴۲) بیالیس اوزان ملے ہیں۔ ناصر کاظمی کے اوزان دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہم عصر شعراء کی نسبت کچھ زیادہ اوزان استعمال کیے ہیں۔ میرے خیال میں ناصر کاظمی کے عہد میں قتیل شفائی ایک ایسا شاعر ہے، جس کی غزلیات کے اوزان تعداد ناصر کاظمی سے زیادہ ہے۔ تین اشعار کو بھی غزلیات میں شامل کیا گیا ہے۔

ناصر کاظمی کے پسندیدہ اوزان

۱۔ خفیف فاعلاتن مفاعلن فعلن
۳۷ غزلیات

۲۔ مجتث مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن
۲۵ غزلیات

۳۔ رمل مسدس مخبون فاعلاتن فعلاتن فعلن
۲۱ غزلیات

ناصر کاظمی کا بنیادی طور پر بڑا اعتبار یہ کوتاہ اوزان میں ملتا ہے۔

خفیف مسدس محذوف مسکّن / محذوف / مقصور / مقصور مسکّن فاعلاتن مفاعلن فعلن / فعِلن / فعلان / فعلان

ناصر کاظمی کا یہ سب سے پسندیدہ وزن ہے۔ جس میں اُنھوں نے بہت خوبصورت غزلیات لکھی ہیں۔

دل تو میرا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
(برگِ نے، ص ۱۲۱)

میر تقی میر نے بھی اس وزن کو بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ جیسے:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا
دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
(میر)

میر تقی میر کے بعد غالب کی بھی دو غزلیات بہت مشہور ہوئی ہیں اور فیض احمد فیض کا بھی غزلیات میں یہ سب سے پسندیدہ وزن ہے، مگر میر سے لے کر ناصر کاظمی تک درمیان میں کوئی بھی ایسا شاعر نہیں ملتا، جس نے اس وزن کو زیادہ غزلیات کی تعداد میں اتنا خوبصورت استعمال کیا ہو، ناصر کاظمی اس وزن میں محنت سے نہیں بلکہ سہولت سے شعر کہتے ہیں۔

یہ غزل کمال کی روانی رکھتی ہے اور پہاڑی راگ میں گائی گئی ہے۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
(دیوان، ص ۳۴)

رمل مسدس مخبون محذوف مسکّن / محذوف / مقصور / مقصور مسکّن فاعلاتن فعلاتن فعِلن فعلن / فعِلان / فعلان

یہ چھوٹا آہنگ بھی ناصر کاظمی کے مزاج سے کافی ہم آہنگی رکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر حسن رضوی: "ناصر کاظمی چونکہ خود دھیمے لہجے کے شاعر تھے اور چھوٹی بحروں سے خاصے مانوس تھے۔" (۳) یہ وزن بھی زیادہ

"برگ نے" میں آیا ہے۔ دیوان میں اس کا اعشاریہ کم ہے۔ ناصر کاظمی نے اس وزن میں بھی خوبصورت اشعار لکھے ہیں۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا
(برگ نے ص ۱۳۸)

ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف مفعول مفاعلن فعولن

اس وزن میں بھی ناصر کاظمی کے ہاں اچھے اشعار ملتے ہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلچسپی ختم ہوگئی۔ یہ صرف "برگ نے" میں آیا ہے۔

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
(برگ نے ص ۴۷)

ہزج مسدس محذوف مفاعیلن مفاعیلن فعولن

یہ وزن عشق ومحبت کی داستاں بیان کرنے اور مثنوی کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے، مگر غزلیات میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے
(دیوان ص ۱۶)

رمل مسدس محذوف فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

یہ دیگر کوتاہ اوزان کی نسبت تھوڑا تیز ہے۔ اردو میں تصوف کے موضوعات پر اس میں کافی لکھا گیا ہے۔

دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہو گئے
(دیوان ص ۳۱)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی کے اوزان میں کچھ تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے۔ دیوان میں انھوں نے چھوٹے اوزان کے ساتھ ساتھ لمبے اوزان میں بھی خوبصورت اشعار کہے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شفق سوپوری:- "ناصر نے زیادہ غزلیں چھوٹی بحروں میں کہی ہیں لیکن ان کی تخلیقی توانائی لمبی بحروں میں بھی اپنا اعجاز دکھا گئی ہے۔" (۵)

رمل مثمن مخبون محذوف مسکن / محذوف / مقصور / مقصور مسکن فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن / فعلن / فعلان / فعلان

چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرو
دل کی افسردگی کچھ کم تو ہوئی ہم نفسو شکر کرو
(دیوان ص ۹۰)

کامل مثمن سالم متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

کوئی اور ہے نہیں تو نہیں مرے روبرو کوئی اور ہے
بڑی دیر میں تجھے دیکھ کر یہ لگا کہ تو کوئی اور ہے
(دیوان ص ۱۲۷)

مگر ان بڑے اوزان میں ایک تکنیکی بات بھی ہے کہ اردو میں بعض لمبے اوزان کے درمیان آہنگ کا وقفہ آتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کا بڑا پن محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اردو میں عربی عروض کے مطابق تقطیع کیے جانے والے بعض بڑے اوزان میں یہ وقفہ آتا ہے۔

جمیل مثمن سالم مفاعلاتن مفاعلاتن

مفاعلاتن مفاعلاتن

گئے دنوں کا سراغ لے کر،
کدھر سے آیا، کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا،
مجھے تو حیران کر گیا وہ

(دیوان ص ۱۳۵)

جو لمبے اوزان ہندی لے رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان بھی وقفہ لازمی آتا ہے۔

متدارک شانزدہ رکنی فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

نئے کپڑے پہن کر جاؤں کہاں، اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا، میں باہر جاؤں کس کے لیے

(دیوان ص ۹۸)

جس کے جواب میں صابر ظفر نے بھی غزل لکھی ہے۔

نئے کپڑے بدل اور بال بنا، ترے چاہنے والے اور بھی ہیں
کوئی چھوڑ گیا یہ شہر تو کیا، ترے چاہنے والے اور بھی ہیں

(صابر ظفر) (مذہب عشق ص ۳۸۴)

مضارع مثمن اخرب مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن
مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

تو ہے عزیز ملت،
تو ہے نشان حیدر
احساں ہے تیرا ہم پر
اے قوم کے دلاور

(نشاط خواب ص ۵۹)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن

اس وزن کی لے بڑی سبک رفتار ہے۔ ناصر کاظمی نے اس میں بہت خوبصورت غزلیات کہی ہیں۔ کوئی بے سُرا بھی اس کو سُر میں گا سکتا ہے۔

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

(برگ نے ص ۱۷)

اس وزن میں ناصر کاظمی کی ایک اور غزل بہت معروف اور زبان زد عام ہوئی ہے۔

کچھ یادگار شہر ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

(دیوان ص ۱۳۲)

ناصر کاظمی بنیادی طور پر کومل سروں کا شاعر ہے۔ اس بات کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بحر ہزج مثمن سالم مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن تیز شعری بہاؤ رکھتا ہے۔ یہ وزن ہر بڑے شاعر کے ہاں تقریباً مل جاتا ہے مگر ناصر کاظمی نے اسے استعمال نہیں کیا۔

ناصر کاظمی کے جو فکری موضوعات یعنی محبت اور ہجرت ہے۔ ان میں ہجر کا کرب بعض دفعہ انسان کی طبیعت اور مزاج کو جذباتی کر دیتا ہے۔ ایسے مضمون کا بیان تیز شعری بہاؤ والی بحور کا تقاضا کرتا ہے۔ شاید اس لیے ناصر کاظمی کے ہاں تیز شعری بہاؤ والے اوزان بھی ملتے ہیں۔

مجتث مثمن مخبون محذوف مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن
محذوف مسکن / محذوف / مقصور / مقصور مسکن
فعلن / فعلن / فعلان / فعلان

یہ تیز شعری بہاؤ رکھنے والا ایک معروف وزن ہے جو حجازی لے رکھتا ہے۔ ہندی اوزان میں کوئی بھی بحر اس وزن سے نہیں ملتی ہے۔ ناصر کاظمی کا بحرِ خفیف کے بعد یہ پسندیدہ وزن ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا مزاج ہندی کے ساتھ ساتھ حجازی لے سے بھی میل کھاتا ہے۔

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اُداس کر کے مجھے
(برگ نے ص ۱۰۶)

ناصر کاظمی کی یہ غزل فریدہ خانم نے بڑے خوبصورت انداز میں گائی ہے۔

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے
(برگ نے ص ۳۷)

ہزج مثمن مقبوض مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا، وہ شکل تو دکھا گیا
(دیوان ص ۱۰۴)

ناصر کاظمی کے کچھ مزید متوسط ثقیل اور متوسط خفیف اوزان ایسے ملتے ہیں۔ جن میں اُنھوں نے چند اچھی غزلیات لکھی ہیں۔

ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

اس وزن کو اُس انداز میں استعمال نہیں کیا، جو اُن کا خاصہ ہے۔

چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں
سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تری یادیں
(دیوان ص ۸۱)

رمل مثمن محذوف فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

یہ وزن بھی نسبتاً کچھ تیز ہے اور ناصر کے عہد کے شعراء میں منیر نیازی نے اسے بہت استعمال کیا ہے۔

کوئی صورت آشنا اپنا نہ بیگانہ کوئی
کچھ کہو یارو یہ بستی ہے کہ ویرانہ کوئی
(دیوان ص ۵۶)

رمل مثمن مخبون فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

ناصر کاظمی نے بھی اس میں چند خوبصورت غزلیات لکھی ہیں۔

کیا لگے آنکھ کہ پھر دل میں سمایا کوئی
رات بھر پھرتا ہے اس شہر میں سایہ کوئی
(دیوان ص ۱۲۲)

ہندی مزاج اور ہندی اوزان کا استعمال:

ان اوزان میں بھی ناصر کاظمی نے خوبصورت اشعار کہے ہیں۔

متدارک شانزدرکنی

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

متدارک چوبیس رکنی

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

اِن سجے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے
(دیوان ص ۲۶)

متقارب تیس رکنی

فعل فعولن فعلن فعلن، فعل فعولن فعلن فع

دور فلک جب دہراتا ہے موسمِ گل کی راتوں کو
کنجِ قفس میں سن لیتے ہیں، بھولی بسری باتوں کو
(برگ نے ص ۶۷)

متقارب مثمن اثلم مخبق فعلن فعلن فعلن فعلن

یہ وزن برگ نے میں شامل نہیں، تاہم دیوان اور "پہلی بارش" میں مسلسل غزل کا تجربہ ہے اور کچھ مصرعے ایسے بھی آجاتے ہیں، جن کی تقطیع ہندی عروض کے مطابق کی جاسکتی ہے۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
(پہلی بارش ص ۳۹)

ناصر کاظمی جب ایسے اوزان میں غزل لکھتے ہیں، جو مقامی موسیقی سے میل کھاتے ہیں تو وہاں پر وہ لسانی سطح پر بھی دیسی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور حروفِ علت کو گرا دیتے ہیں۔ اس شعر میں "گئے" کو "گے" کے وزن پر باندھا گیا ہے۔

تیرے وعدے میرے دعوے
ہو گئے باری باری مٹی
(دیوان ص ۶۷)

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:- "ان کے یہاں غزل کا روایتی اسلوب نہیں ہے کیوں کہ مخصوص الفاظ کا استعمال اور ان کی متناوب دروبست سے انھوں نے ایک نئے وزن و آہنگ کی تخلیق کی ہے۔" (۶)

اس غزل کی تقطیع تو اردو کے رائج عروض سے ہوسکتی ہے

متقارب مثمن اثلم مخبق مقصور
فعلن فعلن فعلن فاع
۱۵ ماترائیں یا حروف

ختم ہوا تاروں کا روگ
جاگ مسافر اب تو جاگ
(برگ نے ص ۴۸)

مگر کچھ غزلیات ایسی بھی آجاتی ہیں، جن کو اردو پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا، ان کی تقطیع ہندی پنگل کے تحت کی جائے گی۔ جیسے یہ غزل ہے۔

فعلن فعلن فعلن فع
۱۴ ماترائیں

اپنی دھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں
(دیوان ص ۴۸)

یہ شعر تو اردو پیمانوں کے ساتھ تقطیع ہوجاتا ہے، جس میں ۱۴ ماترائیں ہیں مگر اس غزل کا ایک شعر اردو عروض کے مطابق تقطیع نہیں ہوسکتا ہے۔

تیرے سوا مجھے پہنے کون
میں ترے تن کا کپڑا ہوں
(دیوان ص ۴۹)

۴ ۳ ۳ ۳ ۳
۱۴ ماترائیں ۳ ۵ ۴ ۲
فعلن فعل فعل فعلن فاع
فعل فعولن فعلن فع

تیرے سوا مجھے پہنے کون
میں ترے تن کا کپڑا ہوں

ان غزلیات میں ہندی پنگل کے تحت ماتراؤں کی تعداد پوری ہے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی رقم طراز ہیں:-

"پہنچے گور کنارے ہم (فعلن فاع فعولن فع)
بس غمِ دوراں کے ہارے ہم (مفتعلن مفعولن فع) (برگ نے ۳۶)
بجھو تیری داوں کی تقدیر (فاع فعولن فعلن فاع)
بجھا بجھا سا ایک دیا (فعول فعلن فاع فعل)

مفتعلن مفعولن فع کی جگہ فاع فعولن فعلن فع بھی رکھا جا سکتا ہے۔ ان چند امثلہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کے ایک ہی شعر میں مستعمل چودہ حرفی ہندی چھند کے وزن کو ہم عربی بحر کے کسی ایک مخصوص وزن کا نام نہیں دے سکتے۔ اس دشواری کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر پروفیسر گیان چند کی ان تجاویز کو تسلیم کر لیا جائے جو انہوں نے اردو کی ہندی بحر میں توسیع اور اضافے کی عنوان سے پیش کی ہیں تو اس سلسلے میں بہت سی دشواریوں کا حل نکل سکتا ہے۔ نہیں تو پھر یہی مناسب ہوگا کہ اردو میں استعمال ہونے والے ہندی چھندوں کے اوزان کو پنگل شاستر کے اصول و ضوابط کے تحت ہی رکھا جائے۔" (۷)

سرسی چھند فعلن فعلن فعلن فعلن، فعلن فعلن فاع
گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
(برگ نے ص ۵۹)

لاونی چھند فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن، فعلن فعلن فعل فعل
یا فعلن فعلن فعلن فعلن، فعلن فعلن فعلن فع

ناصر کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے منہ نہ لگو تو بہتر ہے
(دیوان ص ۱۷۰)

ناصر کاظمی کے ہندی مزاج کے اشعار میں ایسے اوزان بھی ملتے ہیں کہ جن میں ماتراؤں یا حروف کی تعداد میں کمی بیشی ہے جیسے ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے اب اُس پیڑ کے پتے جھڑتے جاتے ہیں (دیوان ص)

اس شعر کے پہلے مصرعے میں چوبیس اور دوسرے مصرعے میں بائیس حروف ہیں۔ ہندی میں ایسے اجتماع بھی جائز سمجھے جاتے ہیں۔ اردو کے دیگر کئی شعراء فانی بدایونی اور فراق گورکھپوری کے ہاں بھی ایسے اجتماع ملتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ان اجتماعات کا اپنی کتاب "اردو کا اپنا عروض" میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ناصر کاظمی کے ہندی اوزان کا مختصر تعارف ممکن ہو سکا ہے۔ ان اوزان پر تفصیل سے بات کرنے کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔

ناصر کاظمی کے عروضی تجربات:

ناصر کاظمی نے جہاں فکری طور پر نئی راہیں نکالیں، اسی طرح ان کے اوزان دیکھ کر یہ واضح پتہ چلتا ہے کہ لاشعوری طور پر نہیں، بلکہ اتنی

بڑی تبدیلی شعوری کوشش سے ہی آسکتی ہے۔
ناصر کاظمی نے نئے عروضی تجربات کر کے کئی متروک یا کم مستعمل اوزان میں بھی غزلیات لکھی ہیں۔ان میں زیادہ تر کوتاہ اوزان ہیں۔ اکثر اوزان میں ایک غزل اور بعض اوزان میں دو غزلیات ہیں۔

ہزج مربع اشتر فاعلن مفاعیلن
رمل مثمن مکفوف مقطوع محذوف فاعلات فاعلات فاعلات فع
دیس سبز جھیلوں کا
کنج کنج نغمہ زن بسنت آ گئی
یہ سفر ہے میلوں کا
(دیوان ص ۱۲۹)

اب سجے گی انجمن بسنت آ گئی (دیوان ص ۱۱۹)

رمل معشر مخبون محذوف
فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن
رجز مثمن مطوی مخبون
مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن
تو ہے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانکپن
تیری گلی گلی کی خیر اے مرے دل رُبا وطن
(دیوان ص ۱۱۰)

متقارب معشر سالم
فعولن فعولن فعولن فعولن
زمیں چل رہی ہے کہ صبح زوال زماں ہے
کہو اے مکینو! کہاں ہو یہ کیسا مکاں ہے
(دیوان ص ۷۶)

متقارب مثمن سالم
فعولن فعولن فعولن فعولن
قفس کو چمن سے سوا جانتے ہیں
ہر اک سانس کو ہم صبا جانتے ہیں
(برگ نے ص ۱۳۳)

متقارب چوبیں رکنی
فعلن فعل فعولن فعلن فعلن فعلن
متقارب تیس رکنی
فعل فعولن فعلن فعلن، فعل فعولن فعلن فع
متدارک شانزدہ رکنی
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن
جمیل مثمن سالم
مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن
بسیط مثمن مطوی سالم
مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن
دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے
زندگی تو ہی بتا کیسے جیا چاہیے
(دیوان ص ۷۱)

عریض مربع سالم فاعلن فعولن
اس وزن کی تقطیع کئی اوزان میں ہو سکتی ہے، مگر سب سے بہتر تقطیع عریض میں ہوگی، کیونکہ عروض کا اصول ہے کہ جس بحر میں کم زحافات لگیں، اس بحر میں تقطیع کی جائے اور دوسرا اصول کے جس بحر کا سالم رکن آتا ہو اس میں تقطیع کرنی چاہیے۔ اس لیے بحر عریض میں زحاف بھی صرف ایک ہی لگتا ہے اور رکن بھی سالم آتا ہے۔
رات ڈھل رہی ہے
ناؤ چل رہی ہے
(دیوان ص ۸۷)

ناصر کاظمی کی کم مستعمل یا متروک اوزان

میں کہی ہوئی بعض غزلیات بہت معروف ہوئی جیسے یہ دونوں غزلیات ہیں۔

ہزج مسدس مقبوض سالم مفاعلن مفاعلن مفاعلن

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
(دیوان ص ۱۳۸)

مدید مربع مکفوف سالم فاعلات فاعلن

اس وزن کی تقطیع تیس (۳۰) بحور میں ہو سکتی ہے مگر سب سے بہتر تقطیع مدید مربع مکفوف میں ہوگی۔

غم ہے یا خوشی ہے تُو
میری زندگی ہے تُو
(دیوان ص ۱۲۸)

ان اوزان میں دو غزلیات ہیں۔

ہزج مثمن مقبوض

مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

متقارب مثمن محذوف

فعولن فعولن فعولن فعل

چمن در چمن وہ رمق اب کہاں
وہ شعلے شفق تا شفق اب کہاں
(برگ نے ص ۱۲۲)

متدارک چوبیس رکنی

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

متدارک معشر سالم

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

رہ نورد بیابانِ غم صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم صبر کر صبر کر
(دیوان ص ۲۰)

متدارک مثمن سالم

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

درد کانٹا ہے اس کی چبھن پھول ہے
درد کی خامشی کا سخن پھول ہے
(دیوان ص ۷۸)

بعض اوزان ایسے ہیں جو غزلیات میں نہیں آئے، مگر اُن میں ناصر کاظمی نے نظمیں لکھی ہیں۔

۱۔ مضارع مثمن اخرب سالم مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

۲۔ جمیل مربع سالم مفاعلاتن مفاعلاتن
صدائے کشمیر (نشاط خواب ص ۵۶)

۳۔ منسرح مثمن مطوی موقوف مفتعلن فاعلات مفتعلن فاعلان تُو ہے مری زندگی
(نشاط خواب ص ۵۸)

۴۔ سمن سویا سیالکوٹ تُو زندہ رہے گا،
(نشاط خواب ص ۵۲)

۵۔ متدارک مثمن مخبون مسکن فعلن فعلن فعلن فعلن اس وزن میں دو نظمیں، اے ارضِ وطن (نشاط خواب ص ۷۴) اور جاڑے کی رات (نشاط خواب ص ۸۰) ہیں۔

مجموعی جائزہ:

ناصر کاظمی نے بے ساختگی، شگفتگی، سادگی اور روانی کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے غزل میں جدت زبان، موضوع اور اپنے مخصوص لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی

انفرادی شناخت بنائی۔ اُنھوں نے چھوٹے اور بڑے تمام طرح کے اوزان میں خوبصورت غزلیات لکھیں ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کے مزاج میں تبدیلی آئی ہے۔

اُنھوں نے بحرِ ہزج کا ایک اور بحرِ متقارب کے دو اوزان جو عربی عروض کے مطابق استخراج ہوتے ہیں۔ دیوان میں اُن کو ترک کر دیا، تاہم ہزج اور رمل کے دو، دو اوزان اور رجز، متقارب، کامل، جمیل، بسیط، عریض اور مدید کا ایک، ایک وزن اور بعض ہندی مزاج کے اور بعض خالصتاً ہندی اوزان ایسے اپنے دیوان میں استعمال کیے جو برگ نے میں شامل نہیں ہیں۔ پہلی بارش میں ایک ہی قافیہ، ردیف اور وزن کی مسلسل غزل کا تجربہ ہے۔ نظموں کی کتاب نشاطِ خواب میں ایسے چھ وزن بھی شامل ہیں، جو غزلیات میں نہیں آئے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناصر کاظمی کا مزاج اوزان کی وسعت، عروضی تجربات اور بہتری کی طرف گامزن ہے۔ اُن کی شاعری میں بلا کی روانی ہے۔ شاذ ہی کوئی مصرع ایسا آتا ہے، جس کی تقطیع کرنے میں دقت پیش آئے۔ زیادہ غزلیات اوزان کوتاہ میں ہیں اور میر تقی میر کے بعد ناصر کاظمی نے جس طرح ان چھوٹے اوزان کو استعمال کیا، ایسی مثال دیگر شعراء کے ہاں اس طرح کی نہیں ملتی ہے۔ اُنھوں نے کئی متروک اوزان میں خوبصورت غزلیات لکھ کر اردو کے غیر معروف اوزان کو مقبول بنایا اور اردو شاعری کے مروجہ اوزان کو مزید وسعت دی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ بشیر رزمی، کائناتِ غزل، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، باراوّل، جون، ۲۰۰۹ء، ص ۳۰

۲۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، ناصر کاظمی شخصیت اور فن، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۶، ۱۲۷

۳۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، اشاعت اوّل، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۶

۴۔ ڈاکٹر حسن رضوی، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر (ناصر کاظمی شخصیت اور فن)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۴۱۹

۵۔ ڈاکٹر شفق سوپوری، اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۷

۶۔ تنویر الرحمٰن، ناصر کاظمی کا شہرِ غزل، ترتیب، مشمولہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ناصر کاظمی اور برگ نے، مطبع، لاہور، اسلامک بک سنٹر، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۴۳

۷۔ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی، جدید مشترک اوزان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، باراوّل، ۱۹۸۹ء، ص ۷۷

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید کی شاعری

شاعری لطیف خیالات و احساسات اور جذبات کے موزوں اظہار کا نام ہے۔ خوبصورت الفاظ کی مناسب ترتیب و تشکیل، حسن ادا اور اظہار و بیان کی جدت و ندرت شاعری میں گہرائی و گیرائی پیدا کرتے چلی جاتی ہیں۔ شاعری دراصل خوبصورت پیرایۂ اظہار کا نام ہے۔

موضوع، انداز بیان، جذبہ و فکر، خوبصورت ڈھلے ڈھلائے الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارات کی دل آویزی شاعری میں ایک الگ انداز میں ظہور پزیری کی کیفیات سے ہم آغوش ہوتی ہے۔

اچھا شاعر اپنے آپ کو خود منوالیتا ہے۔ یہ کسی تشریح، فلسفے یا تحریک کے انجکشن کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ یہ دلوں کی دنیا کو مسخر کرتا ذہن و ذہن حکمرانی کا ڈول ڈالتا چلا جاتا ہے۔

اسے کسی قسم کی بناوٹ، سجاوٹ، زیبائش، آرائش یا نظریے کی لیپا پوتی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مومن کا یہ شعر:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یا غالب کا یہ شعر:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اسی طرح سادگی اور سہل ممتنع کے حامل بے شمار اشعار سادہ اور سہل ہونے کے باوجود بھرپور شعری تاثیر رکھتے ہیں جنھیں نہ صرف یاد رکھنا آسان ہے بلکہ یہ دلوں میں اس طرح کھب جاتے ہیں کہ نکالے نہیں نکلتے۔

شاعری کا تعلق انسان کے اندرون کے ساتھ ساتھ خارج سے بھی ہے۔ ایک بڑے شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے داخلی کرب کو خارج کے المیوں اور مسائل کے ساتھ باہم گوندھ کر تخیل آفرینی کا حقیقت سے امتزاج کر کے فن پارے کو عصری سچائی سے ہم آہنگ

کردے۔

ایک شاعر اس وقت تک اچھی سچی اور پرتاثیر شاعری نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ لمحۂ موجود کی روح میں نہ اُتر جائے۔ ماضی پرستی، مستقبل کے لیے خیالی پلاؤ پکانے والے اور تخیلاتی دنیا میں سانس لینے والے شاعر کبھی بھی عوام کے دلوں پر حکمرانی کا اعزاز حاصل نہیں کرسکتے۔ زندہ رہنے والی شاعری کا تعلق براہ راست انسان اور انسانی مسائل سے ہوتا ہے۔

محترمہ رخشندہ نوید کے شعری مجموعے "نیناں اُتریں پار" کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ نہ صرف اپنے خیالات واحساسات کی ترجمانی پہ قدرت رکھتی ہیں بلکہ مشاہدات، تجربات کی آنچ سے اپنے تخلیقی جوہر کو نکھارنے میں کمال مہارت کی حامل ہیں۔

انھوں نے زندگی کی روح کو سمجھا ہے۔ اس میں اُتر کر دیکھا ہے۔ انسانوں اور انسانی مسائل کے ساتھ گہری وابستگی کے اظہار نے ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ بھر دیا ہے۔ زندگی کے دُکھ، ذاتی کرب، اجتماعی مصائب کی ترجمانی ان کی شاعری میں موجزن ایک ایک لفظ کی اوٹ سے جھانکتی نظر آتی ہے۔

انسان جب اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے اور آدھا سفر طے کرنے کے بعد جب اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ یہ سفر اس کا سفر نہیں تھا تو کرب کا یہ لمحہ جس کی عکاسی رخشندہ نے کی ہے بہت جان لیوا ہے:

عمر آدھی سے زیادہ کاٹ کر اس موڑ پر
میں نے یہ جانا کہ میں اس کی کہانی میں نہیں

.....

گزرتا وقت چہروں پر اپنی دھول چھوڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے چہروں کی پہچان مشکل ہوجاتی ہے۔ غم واندوہ اور درد وآلام نے انسان کے جسم ہی نہیں روح پر بھی ایسے نقوش چھوڑے ہیں جسے انسان صدیوں تک مٹا نہیں پائے گا۔

رخشندہ کی شاعری میں اسی عصری المیے کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے:

وقت اثر انداز ہوا ہے رخشندہ
اب تو ہم بھی بوڑھوں جیسے لگتے ہیں

ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اک یہی سوچ کے گھر رکھ لیا تنہائی کو
یونہی در در پہ پھرے گی تو زائل ہو گی

.....

یہ شعر پڑھ کر ذہن میں فوری طور پر ناصر

کاظمی کے شعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

.....

قربت جب جدائی سے بغل گیر ہوتی ہے تو درد یادوں کی کوکھ سے جنم لے کر خون کے سمندر میں موجزن ہوتا دل کی کشتی میں سوراخ کرتا آنکھوں میں چنگاریاں بھرتا بہتا چلا جاتا ہے:

درد نکلا ہے صبر کی حد سے
اشک نکلے قطار سے باہر
چند لمحوں کی مختصر قربت
اور یادیں شمار سے باہر

.....

یہ ایک حقیقت ہے کہ عشق نہ ذات پات کا قائل ہے نہ امیری غریبی کا نہ رنگ و نسل کا۔ نہ دین و مذہب کا عشق ایک ایسا عارضہ ہے کہ عاشقوں کے لیے اس سے اجتناب برتنا ناممکن ہے کہ دامن گیر ہو کے رہتا ہے۔ انسان لاکھ دامن بچائے، نظر مگر عشق اپنا جادو چلا ہی لیتا ہے:

میں کب ادھر گئی کہ جدھر تھی ہوائے عشق
یہ یاری کیسے جانے مجھے آ کے لگ گئی

.....

عشق کے بغیر عاشقوں کا گزارا بھی نہیں ہے
عشق کے حوالے سے غالب نے خوب فرمایا ہے

.....

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

.....

اظہار ذات، لطیف احساسات و جذبات اور رومان بھرے واقعات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل، سماجی معاملات، ذاتی و اجتماعی فرائض کی نشاندہی بھی ان کی شاعری میں ایک انوکھے انداز میں سامنے آتی ہے:

اور سب کام تہہ کیے سر دست
پہلے بیٹی ذرا بیاہ تو لیں

.....

دیکھ کر گلیوں میں بہتا خوں، پریشاں ہو گئے
پتھروں کے بیچ میں اب اپنا سر بھی نہ دیکھ لے

.....

انھوں نے الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور خیال کو بڑی نزاکت سے برتا ہے۔ ان کی شاعری میں بے شمار اشعار ایسے ہیں جن میں جدید رنگ پایا جاتا ہے:

ٹوٹا تو اسے گود لیا لہروں نے بڑھ کر
پھر بہتا رہا پھول سرِ آب ادھورا

رقاصہ کی صورت ناچ رہا ہے عکس
پتے اڑتے نوٹوں جیسے لگتے ہیں

.....

کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے یا انسان کائنات کے لیے بنایا گیا ہر دو صورتوں میں سے یہ بات طے ہے کہ انسان اور کائنات لازم وملزوم ہیں۔ انسان بحیثیت وجود اور بحیثیت جوہر ہر دور میں کلیدی اہمیت کا حامل رہا ہے اور جب تک کائنات کا وجود ہے، رہے گا بھی:

بقول رخشندہ نوید:

ہمیں رخشندہ ہیں جلتی زمیں پر آبلہ پا
نہ ہم سے رقص چھوٹے گا نہ یہ گھنگھرو تھمیں گے

.....

انسان چاہے کسی بھی ملک، خطے یا براعظم سے تعلق رکھتا ہو اس کے مسائل، دکھ، بے بسی، لاچاری، سوچنے کا انداز، فکری و معاشرتی رویوں میں گہرا اشتراک پایا جاتا ہے:

ہمارے درمیاں یہ دکھ ہی قدر مشترک یاس
سو ہم کو اجتماعی خودکشی کرنی پڑے گی

.....

گلوبلائزیشن نے انسانوں کو ویسے بھی اب ایکدوسرے کے نزدیک اور باہم مربوط کر دیا ہے لیکن اس ارتباط و انسلاک نے مسائل کو حل کرنے کے بجائے اور زیادہ گھمبیر بنا دیا ہے۔

ایک طبقہ روز بروز صاحب ثروت و دولت بنا رہا ہے جبکہ دوسرا مقہور، مظلوم، غریب اور پسماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا جا رہا ہے۔

المختصر رخشندہ نوید ایک ایسی شاعرہ ہیں کہ جنھوں نے غزل یا نظم جس صنف شاعری میں بھی طبع آزمائی کی اس کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری، یکسانیت، ٹھہراؤ اور جمود کے بجائے آگے بڑھنے کا چلن رکھتی ہے۔ تکرار موضوع کے بجائے ان کے ہاں موضوعات کی رنگا رنگی پائی جاتی ہے ان کے شعری مجموعے "نیناں اتریں پار" نے انھیں نہ صرف بطور شاعرہ تسلیم کرایا ہے بلکہ اس بات کی گواہی بھی فراہم کی ہے کہ ان کا شعری سفر روز افزوں نئی منازل کے تلاش میں نئی جہات سے ہم آہنگ ہوتا رہے گا۔

☆☆☆☆☆

فیصل آباد میں تیسرے مجموعے نیناں اتریں پار کی تقریب رونمائی پر مرے مہربان (نامعلوم) نے پڑھا۔
نوٹ: (اگر وہ اس تحریر کو پڑھیں تو مجھے ایک بار پھر شکریہ ادا کرنے کا موقع دیں)

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاولپور، ممبر پبلک سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب "شاہ داستان" تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Miniature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

جب ہم پارک سے نکلے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ پہاڑ اور جنگل بہت پیچھے رہ گئے تھے اور نسبتاً ناہموار زمین شروع ہو گئی تھی۔ ہر طرف گنے کے کھیت نظر آئے۔ گارفیلڈ بتانے لگا "کسی زمانے میں ہوائی سے چینی برآمد کی جاتی تھی لیکن آج کل ایسا نہیں ہے۔ اس کی واحد شوگر مل بند ہونے والی ہے۔ کوئی بھی کارخانہ زیادہ دیر نقصان پر نہیں چلایا جا سکتا۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں چینی اس قدر سستی ہو گئی ہے کہ اتنے دور دراز علاقے سے برآمد بہت مہنگی پڑتی ہے۔" وہ کھنکارا۔

اب ہماری آخری منزل ڈول فارم ہے جہاں انناس کی کاشت کی جاتی ہے۔ انناس

کا پودا اٹھارہ ماہ میں پہلا پھل دیتا ہے۔ ۲۴ ماہ میں دوسرا اور تینتالیس مہینے میں تیسری بار اترتا ہے۔ ایک ایکڑ میں ۲۷۰۰ پودے لگائے جا سکتے ہیں۔ ۵۰ ماہ کے بعد پھل چھوٹا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو اوپر سے کاٹ دیتے ہیں لیکن جڑیں نہیں کاٹتے۔ اس کی بے شمار قسمیں ہیں لیکن برازیل بازی لے گیا ہے۔ سنگاپور، چین اور دیگر ممالک سے بھی پودے منگوائے جاتے ہیں۔ یہاں گنے کے علاوہ پپایا اور تربوز بھی کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔

ڈول فارم پر ہم نصف گھنٹہ رکے۔ انناس کا جوس پیا اور ان کے مرکزی عمارت سے ملحقہ ماڈل فارم میں پھلوں کی کاشت دیکھنے چلے گئے۔ ہر کیاری کے ساتھ ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس میں پھل کی قسم، عمر، خصوصیات اور جس ملک سے پودا درآمد کیا گیا تھا اس کا نام لکھا تھا۔ مستطیل شکل کے کھیت تھے ایک ایکڑ میں چار مستطیلیں تھیں۔ ”کیا ڈول امریکی ہے؟“ میں نے ملازم سے پوچھا۔

”تمام بگ بزنس امریکیوں کے پاس ہے۔ مقامی لوگ صرف وہی کام کرتے ہیں جو تم پارک میں دیکھ آئے ہو۔“

”گویا اچھے دنوں کو یاد کر کے روتے ہیں“

”رونے کے لئے اچھے دنوں کی یاد ضروری نہیں برے دنوں میں زیادہ دیر تک رویا جا سکتا ہے۔“

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ ان کا مقدر سنور گیا ہے۔ خوش حالی نے خیمے گاڑ دیے ہیں اور زندگی سہل ہو گئی ہے۔“

اس کا تو پتہ نہیں البتہ جو بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کچی مچھلی اور باسی گوشت نہیں کھاتے۔ بیماری کی حالت میں جانوروں کی کھال میں نہیں گھستے۔ رہنے کے لئے محل نہ سہی غاریں بھی نہیں ہیں۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ بتیاں جل چکی تھیں۔ سارا ہونا لولو جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ غالباً سیاحوں کا نیا ریلا آیا تھا۔ ہوائی میں سمندر کی لہروں کی طرح سیاحوں کی بھی بہت لہریں آتی ہیں۔

دن بھر کے سفر سے تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدلے اور فون پر کافی کا آرڈر دیا۔ کافی آ گئی تو میں نے حسب عادت سگار سلگایا۔ کافی کے کپ سے نکلتی ہوئی دودھیا بھاپ، ہوائی سگار کا دھواں، باہر ٹھاٹھیں مارتا ہوا وسیع و عریض سمندر اور شیرٹن کا آرام دہ کمرہ۔ میں نے دنیا کے بہترین ہوٹلوں میں قیام کیا ہے۔ بعض اوقات فرائض منصبی کے سلسلے میں، اکثر احباب کی مہربانیوں کی وجہ سے اور کبھی کبھی اپنی جیب کو بھی ہوا کھلائی ہے۔ نیویارک کا والڈورف اسٹوریا، ویگاس کا ایم جی ایم گرینڈ، کین کارلٹن ہوٹل، مانٹی کارلو کا وائٹ لیف ہوٹل، لندن کا ڈارچیسٹر، زیورچ کا دریائے لمات کے کنارے کھڑا ہوا ہلٹن لیکن جو حسن، گرینجر اور کج دھج ہوائی شیرٹن کی ہے

کہیں بھی نہیں۔ سگار کے کش، کافی کے گھونٹ، سمندری ہوا کا لمس، کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجھے اُونگھ آ گئی۔ میں سو رہا تھا، جاگ رہا تھا یا بیک وقت ان دونوں کیفیات سے گزر رہا تھا۔ اچانک میری نظروں کے سامنے ایک ہیولا اُبھرا۔ اندھیرا چھٹتا گیا اور نقش صاف اور واضح ہوتے گئے۔ یہ کیپٹن کک تھا جو میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھا لیکن دوسرے لمحے سمندر سے بھی بڑی غم کی لہر نے مجھے دبوچ لیا۔

"مجھے تمہاری ناگہانی موت کا بڑا افسوس ہے۔ بحرالکاہل اپنے کھوجی، محسن اور مربی سے محروم ہو گیا۔"

بولا "ایسا ہونا ہی تھا۔ تاریخ کی ناگزیریت Inevitability کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر میں اپنا مشن مکمل کیے بغیر مر جاتا تو مجھے بھی دکھ ہوتا۔ میں ایک اعتبار سے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ سمندر کی سرکش موجیں میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں، اپنے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں کام تمام ہو گیا۔"

"تم نے یقیناً تاریخ کے سینے پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ آج جب ہم دنیا کو گلوبل ولیج کہتے ہیں تو لامحالہ نظریں تمہارے کارناموں پر پڑتی ہیں۔ تم نے اڑھائی سو سال پہلے ہی اس دنیا کو بہت چھوٹا کر دیا تھا اور برٹش ایمپائر کو عظیم سے عظیم تر بنا دیا تھا۔"

بولا "اگر ہم اس حیات برق رفتار کو دیکھیں تو یہ وقت کے سمندر میں ایک بوند کی مانند ہے۔ جو ہم سے پہلے تھے، جو ہمارے بعد آئیں گے سب پیوند خاک ہو گئے ہیں۔ لہٰذا چند سال اِدھر اُدھر کچھ معانی نہیں رکھتے۔ اگر اس روز دست قاتل کسی وجہ سے رُک بھی جاتا تو میں کتنا عرصہ جی لیتا۔ انسان کو لمحوں کا حساب رکھنا چاہیے اور اس زندگی کو امانت سمجھ کر گزارنا چاہیے۔"

"تمہاری قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ دست قاتل کو تو کوئی نہیں روک سکا لیکن سرخی لب خنجر نے تمہیں امر کر دیا ہے۔"

ایک سوگوار مسکراہٹ کے ساتھ بولا "اگر مجھے سو بار بھی زندگی عطا ہو تو میں اپنے ملک و قوم کی خاطر قربان کر دوں گا۔ جو لوگ برطانیہ کو مچھیروں کی قوم کہتے ہیں وہ تاریخ سے تعصب برتتے ہیں یا پھر اپنے خبث باطنہ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے لئے طویل جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کیا تمہیں علم ہے کہ میں تین مرتبہ جنوبی بحرالکاہل کے سفر پر نکلا ایک دفعہ Taheti میں، Trasit of Venus کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے، دوسری مرتبہ میں نے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ دریافت کیے اور آخری مرتبہ بحرالکاہل اور بحر اوقیانوس کے درمیان نزدیکی راستہ تلاش کر رہا تھا کہ ہوائی میں یہ حادثہ پیش آ گیا۔ ان دنوں سمندری سفر بہت مشکل تھا۔ چھوٹے چھوٹے جہاز تھے جن کو سمندری طوفان اس طرح اُچھالتا تھا جیسے پہلوان مگدر گھماتے ہیں۔ آج کل کی طرح ایئر

کرافٹ کیریئر نہیں تھے جنہوں نے سمندر کی کمر دوہری کر دی ہے اور خطرے کی بو سونگھتے ہی SOS کے سگنل دینا شروع کر دیتے ہیں۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا مشکلات کا" کک نے اپنا پرانا پائپ سلگایا "جب ہم نے راس اُمید کراس کیا تو ملاحوں کی اُمیدیں دم توڑنے لگیں۔ واپس وطن جانے کی خواہش نے ان کے بازوؤں کو شل کر دیا۔ کچھ بیمار پڑ گئے اور باقی ہمت ہار بیٹھے۔ سکروی Servy سمندری سفر کی سب سے بڑی لعنت۔ اس بیماری نے اس دور کے جہاز رانوں کی کمر توڑ دی تھی۔ میں نے اس کا مستقل علاج دریافت کیا۔ ملاحوں کی ہمت بندھائی اور نافرمانوں کو سخت سزا بھی دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ روانہ ہوئے اور انہوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے جن کا نتیجہ آج تمہارے سامنے ہے۔"

"تم ایک معمولی انسان تھے، ایک کباڑیے کے ملازم۔ میں احتراماً لفظ حقیر استعمال نہیں کرتا تمہارا کام دکان کے شٹر گرانا، مالک کے لئے چائے پانی لانا اور کاک روچ مارنا تھا۔ اس ملازمت کے دوران تمہارا آخری کارنامہ مالک کی چوری کرنا تھا۔ اس قدر کارہائے نمایاں سرانجام دینے کا خیال تمہیں کیسے آیا؟"

بولا "پیدائش کسی کے بس کی بات نہیں۔ کوئی منہ میں چاندی کا چمچ لے کر پیدا ہوتا ہے تو کسی کے منہ میں لوہے کی سلاخ تک نہیں ہوتی لیکن بعد میں انسان اپنی قسمت خود سنوارتا ہے۔ میں تقدیر اور تدبیر کے فلسفے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن میرا ایمان ہے کہ تقدیر بھی اکثر ان لوگوں کی مدد کرتی ہے جو جستجو کرتے ہیں، جدوجہد کرتے ہیں۔ میرا بچپن یقیناً عسرت و تنگ دستی میں گزرا۔ میرا باپ ایک غریب انسان تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب غریبی ایک گالی تھی دُشنام تصور ہوتی تھی، شاید آج بھی ہے۔ مجھے جو ملازمت ملی وہ ذلت آمیز تھی لیکن میرے اندر کا انسان مرا نہیں تھا۔ وہ ہر وقت مجھے للکارتا رہتا اُٹھو، اُٹھو اور کچھ کر ڈالو۔ چنانچہ میں نے اس ماحول سے بغاوت کر ڈالی۔ ان فرسودہ روایات کو توڑا اور چوری کی۔ کسی نے کہا تھا "ذرائع مقصد کا جواز ہیں Ends justify means شاید تم جیسے سرگشتہ خمار رسوم و قیود لوگ اس سے اتفاق نہ کریں لیکن ذرا سوچو تو اگر آج وہ نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا۔ میں نے بحرالکاہل کے پانیوں کو مسخر کیا، سمندروں پر حکمرانی کی، آج آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، بحرالکاہل کے جزیرے دولت مشترکہ کے ممبر ہیں۔ ایمپائر کا سورج غروب ہو گیا ہے لیکن اُفق پر سرخی اب بھی صاف نظر آتی ہے۔ ایک فانی انسان کو اپنی زندگی اور اس کے بعد اور کیا چاہیے؟"

"لیکن وہ جزیرے جہاں تم نے جام شہادت نوش کیا میں اس کو شہادت کہوں گا۔ برطانیہ کے ہاتھوں سے نکل گئے اور آج ان

پر انکل سام کا تسلط ہے؟"

"شاید ان کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ اگر انکل سام آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پر ہاتھ ڈالتا تو پھر دیکھتے کیا ہوتا۔ ویسے میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاؤں؟" اس نے سرگوشی کی "انکل سام اور ٹام! کیا تم انہیں الگ شمار کرتے ہو؟ وہ کون سی باتیں ہیں جو دو انسانوں کو دو قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر لے آتی ہیں۔ مشترک دشمنی اور مشترکہ مفادات۔ یہ دونوں ملک ایک ہی تختے پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں۔ امریکہ لاکھ طاقت ور سہی لیکن برطانیہ جتنا ذہین اور چالاک نہیں۔ علاوہ ازیں وہ مسکرایا۔ After all we are cousins"

"تمہاری موت نے جہاں دنیا کو ہلا کر رکھ دیا وہاں ایک طبقہ خوش بھی تھا۔ کلر جی، پادری تمہیں دہریہ گردانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمہیں اپنے اعمال کی سزا ملی ہے۔ تم نے انسان ہو کر دیوتا بننے کی کوشش کی ہوائی کے لوگوں کو سجدہ ریز کیا اور اس طرح تمہیں اپنا سبو سرمست کر گیا۔"

"ایسی بات نہیں تھی" کک نے وضاحت کی "میں رب المشرقین ورب المغربین کا ایک حقیر بندہ تھا جس نے اسے طاقت اور توانائی بخشی۔ ہوائی کے لوگ تو سورج کو دیکھ کر سجدہ ریز ہو جاتے تھے، سرداروں کو خدا مانتے تھے، ان دیکھی طاقتوں اور قوتوں پر یقین رکھتے تھے اس لئے ایک ایسے اجنبی کو دیکھ کر جس کے پاس بڑے بڑے جہاز تھے، بندوقیں تھیں اور جس کا رنگ گورا تھا، لباس ملٹی کلرڈ تھا، ان کا حیران ہونا قدرتی بات تھی۔ وہ مجھے اپنے خدا لونو کا اوتار سمجھ بیٹھے۔ میں انہیں کیا کہتا مجھو مت۔ اپنے عقائد بدل ڈالو اپنی روایات سے انحراف کرو۔ یقین کرو اجنبی مسافر" اس نے اپنا پرانا پائپ پھر سلگایا "وہ مجھے پہلے دن ہی مار ڈالتے اور میری ہڈیاں عبادت گاہوں کی زینت بن جاتیں۔ وحشی کتنا ہی نوبل کیوں نہ ہو وحشی ہوتا ہے اس کی جبلتیں تبدیل نہیں ہوتیں"

"لیکن تم جیسا زیرک انسان ان کے قابو میں کیسے آ گیا۔ بالفرض تم نے سردار کو گرفتار ہی کرنا تھا تو زبردست فورس لے کر جاتے۔ کم از کم لڑتے ہوئے تو مرتے یوں کسمپرسی کے عالم میں تو نہ رخصت ہوتے۔"

"دراصل جب انسان کے دن پورے ہو جاتے ہیں تو اس کی عقل پر بھی دھند چھا جاتی ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کمزور لوگ یوں دست درازی پر اتر آئیں گے۔ احتیاطاً میں بارہ بندوق بردار ملاح ساتھ لے کر گیا تھا جنہوں نے بزدلی دکھائی اور مع لیفٹننٹ ولیم سن کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مجھے اپنی موت کا اتنا قلق نہیں لیکن انہوں نے یونین جیک کی تذلیل کی اور ایک عظیم ملک کے نام پر بٹہ لگایا" کک کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

"کیا تم کوئی پیغام دینا چاہتے ہو؟"

"میری کہانی ہی میرا پیغام ہے۔ زندگی حرکت اور جہد مسلسل کا نام ہے۔ نامساعد حالات میں زندہ رہنے کا عزم۔"

"جس ملک و قوم کے لئے تم نے اتنی بڑی قربانی دی وہ آج کل نامساعد حالات کا شکار ہے۔ ایمپائر سکڑ کر ایک جزیرے تک محدود ہو گئی ہے اور جزیرہ اب مٹتا نظر آتا ہے۔"

"تم اس قوم کو نہیں جانتے" کک نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ "انہیں زندہ رہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ تمام نو آبادیاتی طاقتیں بے عزت اور بے آبرو ہو کر کالونیوں سے نکلی ہیں۔ فرانس کی جو دُرگت ویت نام اور الجیریا میں بنی ہے تم اس سے آگاہ ہو۔ ولندیزیوں کو یک بینی دو گوش انڈونیشیا سے نکالا گیا۔ جرمنی کے حصے بخرے ہو گئے۔ ہندوستان نے گوا پر قبضہ کرتے ہوئے پرتگیز یوں پر تھوکا تک نہیں لیکن میری قوم آنے والے حالات کا ادراک رکھتی ہے۔ اس نے صلح صفائی سے اپنے مقبوضہ علاقے چھوڑ دیے۔ کسی قسم کی رسوائی کا سامنا نہیں کیا۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ برٹش کامن ویلتھ میں ستر ممبر ملک ہیں جن کا لیڈر برطانیہ ہے۔"

کک نے یہ کہہ کر ہاتھ ملایا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھوں کی ہڈیاں کڑکڑا رہی ہوں۔ اس قدر مضبوط ہاتھ۔ اس کے لہجے اور یقین کی طرح۔ میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں کوئی ذی روح نہ تھا باہر سمندر کی لہروں کا شور بڑھ گیا تھا۔ ایک دم تاریخ اور تاسف نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔

اگر ہوٹل آپریٹر مجھے ویک اپ کال نہ بھی دیتی تو بھی میں اُٹھ بیٹھتا، میں سو نہیں رہا تھا محض آنکھیں بند کئے کرسی پر دراز تھا۔ تاریخ کے دھارے پر بہتے ہوئے مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس المیہ ڈرامے کا عینی گواہ ہوں۔ جیسے کک میری آنکھوں کے سامنے زندگی کی قید سے رہا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، پانچ بج رہے تھے۔ سمندر کی موجیں بھی رات بھر دھما چوکڑی کے بعد سو گئی تھیں۔ دُور کسی جہاز کی روشنیاں مدھم ستارے کی طرح لرز رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر جوگرز پہنے اور سیر کے لئے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ برگد کے درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے جب میں سڑک پر آیا تو کنارے پر دو نوجوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک نے نیکر اور ہاف سلیو کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور دوسری کا لباس دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سمندر سے تازہ تازہ اشنان کر کے لوٹی ہو۔ ہوائی کے لوگ بھی سحر خیز ہیں۔ میں نے سوچا اور جب ان کے قریب سے گزر رہا تھا تو ان میں نیکر والی لڑکی نے جس کا قد لمبا اور جسم مناسب تھا مجھے آواز دی۔ میرے تیز قدم ایک دم رُک گئے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

"Do you want sex?" اس نے میری طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟" میں غالباً ذہنی طور پر اس قسم کی پیشکش کے لئے تیار نہ تھا۔

"Am I speaking greek?"

اب کے وہ دونوں مسکرا پڑیں۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے! میں نے فوراً بھانپ لیا کہ میں کن کے نرغے میں ہوں۔

"کیا وقت دیکھا ہے؟ اس قدر پاکیزہ ماحول ہے۔"

"اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ کیا تم پانی کا گلاس وقت دیکھ کر پیتے ہو؟"

"لیکن میرا بٹوہ کسی مفلس کے گالوں کی طرح پچکا ہوا ہے۔" میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"اچھا جوک ہے۔ جو شخص ہزاروں میل سفر کر کے ہوائی شیرٹن میں ٹھہرے وہ یقیناً ایک غریب انسان ہوگا۔" دونوں نے اب کے باقاعدہ قہقہہ لگایا۔

"سپیدۂ سحر پھوٹ رہا ہے۔ میرے جوگر اور ٹی شرٹ سے تم نے اندازہ کر ہی لیا ہوگا کہ میں کس مقصد کے لئے باہر نکلا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم انتظار کر لیتی ہیں۔ تمہارا کمرہ نمبر کیا ہے؟"

میں نے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا ساحل کی طرف چل دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ شیرٹن سے لے کر آؤٹ رگر ملیہ ہوٹل تک اور اس کے اردگرد بے شمار عورتیں کھڑی تھیں، ٹولیوں کی شکل میں۔ اکا دُکا لوگ آ جا رہے تھے لیکن بہت کم بھاؤ تاؤ میں مصروف تھے۔ گاہک کم تھے اور حسن کی فراوانی تھی۔ ایک بوڑھا امریکی کار میں بیٹھا چند جوان نیگرو لڑکیوں سے سودے بازی کر رہا تھا۔

میں ساحل کے ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے چلتا گیا۔ چلتے چلتے اس پارک میں آ گیا جو میں نے پہلے دن شام کو دیکھا تھا۔ پارک میں اس وقت بہت کم لوگ سیر کر رہے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔ اس قدر خوبصورت ماحول، معتدل موسم اور سیر کے دلدادہ اہل مغرب! کیا یہ محض اتفاق تھا یا یہاں آ کر عادتیں بدل گئی تھیں۔

یہی سوال جب میں نے پارک میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے شخص سے کیا تو اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کر ڈالا "تم ہوائی کیا لینے آئے ہو؟ اگر مارننگ واک ہی کرنا تھی تو کیا گھر سے نکلنا ضروری تھا۔" میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہنے لگا "یہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن بے چین گزرتے ہیں۔ ہر شخص فطرت کا اس قدر دلدادہ نہیں ہوتا۔ چند دن سیر نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ زندگی میں کون سا بار بار ہوائی آنا نصیب ہوتا ہے۔ سیاح لذیذ کھانے کھاتے ہیں، عمدہ شراب پیتے ہیں، ساحل پر گھنٹوں نرم ریت پر لیٹے رہتے ہیں۔

شباب کی یہاں بہت فراوانی ہے اس کا اندازہ تو تمہیں ہوٹل سے نکلتے ہی ہو گیا ہوگا۔"

"مجھے حیرت ہوئی ہے کہ میں سحر خیز ہوں، جہاں گرد ہوں، دنیا کے ہر بڑے شہر میں میں نے مارننگ واک کی ہے لیکن اس قسم کا ماحول صرف یہاں دیکھا ہے۔ عموماً یہ کاروبار شب کی سیاہی میں ہوتا ہے۔"

کہنے لگا "تم اسے شفٹ سسٹم کہہ سکتے ہو۔ جس طرح ملوں میں مزدور شفٹوں میں کام کرتے ہیں، ٹیکسی ڈرائیور آٹھ گھنٹے کے بعد ڈیوٹی بدل لیتے ہیں، اسی طرح یہاں کی کال گرلز نے بھی اوقات کار اور علاقے بانٹ رکھے ہیں۔ یہ بھی تو ایک قسم کی محنت مزدوری ہے۔" شفٹ سسٹم پر اس کا لہجہ زہر خند ہو گیا۔

پرل ہاربر: جب کوچ چلی تو ڈرائیور کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ جس قدر گارفیلڈ بیٹا کٹا تھا شارلٹ اتنی ہی ڈبلی پتلی اور سمارٹ تھی۔ نہایت شستہ انگریزی میں اس نے ہمیں خوش آمدید کہا گارفیلڈ کی طرح کدال نہیں چلائی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے بات نہیں کر رہی الفاظ کا گرم شیر پلا رہی ہے، ایسا دودھ جس میں چینی کے بجائے شہد گھلا ہو۔

ہم نصف گھنٹے میں پرل ہاربر پہنچ گئے۔ سیاحوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ ٹکٹ خریدنے میں ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ پہلے ہال میں ہمیں پرل ہاربر فلم دکھائی گئی۔ جاپان کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ ملاح سنبھل نہ سکے۔ ۲۰۰۱ ملاح، ۲۲۳ فوجی اور ۱۰۳ میرین مارے گئے۔ دشمن نے شب خون مارا تھا جوابی کارروائی میں ان کے ۳۹ جہاز گرے اور پچاس ہوا باز لقمہ اجل بنے۔ فلم کے بعد سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ناخوشگوار صورت پیدا ہو گئی۔ جب میں نے پوچھا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں کتنے لوگ مرے تھے تو اس امریکن افسر کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ بولا "سوال Irrelevent ہے میں پرل ہاربر سے باہر نہیں جا سکتا۔"

میں نے کہا "سوال بالکل متعلقہ ہے اور یہ تاریخ کے ہر موڑ پر پوچھا جائے گا۔ کسی نہ کسی کو ایک دن جواب تو دینا ہوگا۔"

It will not be me کہہ کر اس نے مائیک بند کر دیا۔

ہم بوٹ میں بیٹھ کر ایری زونا میموریل گئے۔ سو گز لمبائی اور بیس گز چوڑائی لئے یہ یادگار سمندر کے درمیان بنائی گئی ہے۔ اسی جگہ ایری زونا جہاز جاپانی بمباری سے ڈوبا تھا۔ مرکز میں ایک ستون پر ان ملاحوں کے نام لکھے ہیں جو مارے گئے تھے۔ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہوائی کا گورنر Joseph. B. Poindexter ہال ہال بچا۔ وہ سیدھا ریڈیو اسٹیشن گیا اور ڈیفنس ایکٹ کی رو سے ایمرجنسی کا اعلان کر دیا۔ صدر روز ویلٹ سے مشورے کے بعد ہوائی میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اس وقت ہوائی میں ایک لاکھ

ساٹھ ہزار جاپانی بستے تھے۔ سب کو گرفتار تو نہ کیا جا سکتا تھا لیکن پھر بھی مشکوک افراد دھر لئے گئے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ جاپان بہت بڑی غلطی کر بیٹھا روز ویلٹ کو جنگ میں شامل ہونے کا جواز مل گیا۔

بس چلتے ہی شارلٹ نے اعلان کیا کہ اگلی منزل پارلیمنٹ بلڈنگ اور کنگ پیلس ہے۔ یہ کوئی زیادہ دور نہیں کیونکہ شہر بھی میری طرح مختصر ہے۔

اسمبلی بلڈنگ چھوٹی لیکن متاثر کن ہے۔ اس کی تعمیر میں ہوائی کے کلچر کی آمیزش ہے۔ ستون بڑے بڑے پام ٹریز کی شکل کے ہیں۔ باہر سیاہ جالی لگی ہوئی ہے جو لاوا اور آتش فشاں پھٹنے کی علامت ہے۔ ایوان نمائندگان اور سینیٹ بلڈنگ کے درمیان ایک بہت بڑی Plaque لگی ہوئی ہے جس میں فادر ڈیمیل کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔ وہ ایک پادری تھا جو دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے آیا تھا۔ بشپ میوزیم دیکھتے ہوئے ہم شاہی محل پہنچے۔ میوزیم میں پرانی چیزیں رکھی تھیں۔ پرانے ہتھیار، آلات موسیقی، خداؤں کے ٹوٹے پھوٹے مجسمے، پتوں اور جانوروں کے پروں سے بنے ہوئے سرخ اور زرد ملبوسات، کچھ بے نام اور گمنام تحریریں - دیمک خوردہ دستاویزات، پینٹنگز، یہ چیزیں دلچسپ تو ضرور ہیں لیکن انسان کو ورطہ حیرت میں نہیں ڈالتیں۔

کہاں پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب و ثقافت۔ فراعنہ مصر کی حنوط شدہ ممیاں، اہرام، اسفنکس، وادی لگژر، گندھارا آرٹ، موہنجو داڑو اور ہڑپہ، روم کے کھنڈرات، سکندر یونانی کے آلات حرب اور کہاں دو سو سال کی مختصر تاریخ۔

آئی آو لانی محل (Iolani) بھی ونڈسر پیلس یا دلی قورٹ تو نہیں تھا لیکن مقامی تناظر میں خاصی محنت سے بنایا گیا تھا۔ چونتیس سیڑھیوں کے پلیٹ فارم پر اور بارہ رومن طرز کے ستونوں پر کھڑا یہ محل ۱۸۹۲ء میں بنا۔ چالیس کمروں پر مشتمل اس تین منزلہ عمارت میں اب کوئی نہیں رہتا۔ قومی اثاثہ سمجھ کر حکومت نے اس کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہر چیز اپنی اصل حالت میں رہے۔ بادشاہ اور ملکہ کا، شب باشی کا کمرہ، شب باشی کا لباس، خوبصورت منقش پردے، ساگوان کی لکڑی کے بنے ہوئے پلنگ، دیگر ساز و سامان، زیورات، ہتھیار مختلف کمروں میں سجائے گئے ہیں۔

الموانا شاپنگ سنٹر ہماری آخری منزل تھی یہ ہونولولو کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہے۔ دنیا بھر کا سامان موجود ہے۔ ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد میں نے ایک چوبی مجسمہ خریدا۔ ہوائی کا جنگجو سینہ تانے اپنے بلم کو پوری قوت کے ساتھ دشمن کی طرف پھینک رہا ہے۔ ہوائی کی نشانی، چالیس ڈالر میں مہنگی نہیں تھی۔

[جاری ہے۔]

زندگی بس ریاضی کا پرچہ نہیں

زندگی بس ریاضی کا پرچہ نہیں

دو اور دو
چار ہی کا سبق
سیکھ لینے سے ہر کام چلتا نہیں
زندگی بس ریاضی کا پرچہ نہیں

ہے یہ وہ درسگاہ جس کی چھت کے تلے
کوئی مضمون ایسا نہیں جو نہ ہو
جو بھی سوچو کبھی جو بھی منہ سے کہو
ہر جواب اس کے دامن میں محفوظ ہے
خامشی ہے گنہ، اس کی چھت کے تلے
عقل کی ہے پنہ، اس کی چھت کے تلے

اس زمین و زماں کے خم و پیچ میں
جو بھی موجود ہے
علم کی دسترس سے ہمیشہ رہے
دُور اور ماورا
یہ تو ممکن نہیں

ہاں کسی بات کے
ایک حصے کی کچھ دیر پوشیدگی
اس لیے ہے روا
جستجو کا عمل
پُر مسرت بھی ہو اور جاری رہے
جستجو علم ہے علم ہے جستجو
اور کچھ بھی نہیں اس سفر کے سوا

امتحاں کا مگر ہے عجب سلسلہ
بسکہ کچھ بھی کہیں ایک جیسا نہیں
سب کے پرچے الگ
سب کے مضموں جدا
نقل سے بھی یہاں کام چلتا نہیں
اور یہ بھی ستم
ان کے حل کے لیے
ایک سا وقت بھی سب کو ملتا نہیں

امجد اسلام امجد

گل بار

(گلگت سے واپسی پر)

انتظار اپنے نگر میں بھی
کوئی کرتا ہے
اور
یہاں سے بھی نہ جاؤں
مرا جی کرتا ہے
چاہتیں اتنی
کہ گٹھڑی نہ سنبھالی جائے
بوجھ ایسا
کہ کمر اور قوی کرتا ہے

پلی بارگین

سن اے ظالم!
مرا دل تو نے لوٹا ہے
تجھے رسوا زمانے بھر میں
کر دوں گا
ترے سر اور بھی سنگیں کئی الزام
دھر دوں گا
پر اک راہ اماں بھی ہے
کہ اب ملتے رہیں مجھ کو
سدا تحفے ترے لطف و محبت کے
تقاضے ہیں یہی
جرم و سزائے حسن و زینت کے

جلیل عالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

1972

کتنے ارمانوں سے میں نے
اپنا گھر تعمیر کیا تھا
اپنے خوابوں کو
اس گھر کی خوشیوں سے تعبیر کیا تھا
اس کی دیواروں کے رنگ میں
میرے خون کی سرخی تھی
اس کی بنیادوں میں میرے
دونوں بازو کام آئے تھے
میرے جسم کے ٹکڑوں پر
اس گھر کی بنیاد اٹھی تھی
میں خوش تھا
اپنا سب کچھ دے کے میں خوش تھا
میرا گھر تعمیر ہوا تھا
یہ میرا اپنا گھر تھا

اس گھر کی اک پوری منزل
میرے سر پر آن گری ہے
دیواریں بے جوڑ کھڑی ہیں
دروازے بازو پھیلائے
اپنی پرنم آنکھوں سے
میری جانب تکتے ہیں

اور میں گم صم
گھر کی دہلیز پہ بیٹھا
اپنے زخموں کو گنتا ہوں

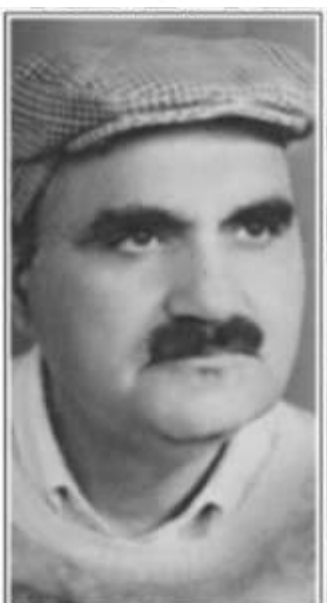

جمیل یوسف

بیادِ سقوطِ ڈھاکہ (۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء)

نسیم سحر

ہر آنکھ شعلہ فشاں ہوئی جب سقوطِ ڈھاکہ کی یاد آئی
لہو کی ندی رواں ہوئی جب سقوطِ ڈھاکہ کی یاد آئی

یہ داستاں یوں بیاں ہوئی جب سقوطِ ڈھاکہ کی یاد آئی
کہ آنکھ میری زباں ہوئی جب سقوطِ ڈھاکہ کی یاد آئی

شکستگی کے عمل نے یکدم مرے بدن کو نچوڑ ڈالا
ہر اک گھڑی امتحاں ہوئی جب سقوطِ ڈھاکہ کی یاد آئی

میں اپنے اشکوں کو ضبط کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا ہوں
یہ سعی بھی رائیگاں ہوئی جب سقوطِ ڈھاکہ کی یاد آئی

جو میں نے تعمیر کی ہوئی تھی وہ ایک دیوار ضبطِ گریہ
مثالِ ریگِ رواں ہوئی جب سقوطِ ڈھاکہ کی یاد آئی

مجھے نسیمِ سحر دسمبر کی سولہ تاریخ کیسے بھولے
سوز زندگی بے اماں ہوئی جب سقوطِ ڈھاکہ کی یاد آئی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ چاند جہاں بچھڑا تھا، وہ موڑ تو پھر آ نکلا
وہ صبح یہیں ٹھہری تھی، لمحات ہیں کچھ دیکھے سے

بیداد

آج پھر تجھ سے ملاقات ہوئی
پھر وہی طرزِ تغافل کہ مری جانِ حزیں
اپنی نادیدہ تمناؤں کے انبار تلے
برزخِ دہر کی تاریک کمیں گاہوں میں
خواہشِ وصل کی جاں سوز عقوبت کے
سیہ خانوں میں
اپنی ناکردہ گناہی کی (پشیمان) اسیر!

تیری بیداد نظر پاسِ تعلق جاناں
تیرے معتوب طلبگار کی (ہر ساعتِ بیدار کی)
دم سازی رہی
میں تجھے کیسے بتاؤں کہ تری چارہ گری
میرے احساسِ ندامت کا مداوا نہ بنی

چارہ گر تو نے عذابوں میں مجھے ڈال دیا
اب وہی میں ہوں، وہی شام، وہی تیرا خیال
اک روایت جو شعورِ غمِ جاں کی صورت
ایک احساس جو شرمندۂ تعبیر رہا!!

سید افسر ساجد

امن کی خوشبو

بیج محبت کا اک بو دیں
نرمی کا کچھ پانی دے دیں
عفو کے موسم میں یہ اک دن
خوب پلے گا خوب بڑھے گا

تھوڑے وقفے سے پھر اس میں
صبر و تحمل کے ہاتھوں سے
آہستہ سے گوڈی کر لیں

رکھیں ایک خیال کہ اس میں
بوئی اک رنجش کی نہ پھیلے
دیمک چاٹ نہ لے تلخی کی
خود غرضی کی دھوپ نہ ٹھہرے

تسکیں کی کونپل پھوٹے گی
آسائش کی کلیاں ہوں گی
پھر یہ کتنا پیارا ہو گا
ہر سو امن کی خوش بو ہو گی

منظور ثاقب

عزرائیل سے مکالمہ

[نثری نظم]

ٹھیک ہے کل میرا ساٹھواں جنم دن تھا

یہ بھی سچ ہے

کہ خدائے بزرگ و برتر نے

میری عمر ساٹھ برس ہی مقرر کی تھی

لیکن تم ابھی سے میری جان لینے کیسے آ گئے؟

ساٹھ برس

لیکن اِس میں سے دس برس تو

زندگی کی چھوٹی چھوٹی لعنتوں کو ترستے بیت گئے

پندرہ برس فُرقت کے دُکھ کی نذر ہوئے

بیس برس لوڈ شیڈنگ کھا گئی

دس برس دہشت گردی کے خوف سے

کانپتے بیت گئے

باقی کیا بچا؟

فقط پانچ برس ہی نا!

ٹھیک ہے خالقِ کائنات نے

میری عمر ساٹھ برس ہی مقرر کی تھی

لیکن ابھی تو فقط پانچ برس ہی گزرے ہیں

ابھی تو حساب کتاب ہی پورا نہیں ہوا

تو تم ابھی سے میری جان لینے کیسے آ گئے؟

ابھی تو پچپن برس کا حساب باقی ہے

سو جاؤ اور پچپن برس بعد آنا

اور یہ امانت لے جانا

اگر یہ پچپن برس

پچپن برس کی صورت گزر گئے تو

ازھر منیر

ناشکرا

[نثری نظم]

مانا کہ تم سب کچھ نہیں کر سکتے

پھر بھی کتنے بہت سے کام ہیں

جو تمھارے لیے کرنا ممکن ہیں

تم سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر

آتی جاتی گاڑیوں، اونچی عمارتوں

کوٹھیوں اور بنگلوں کو

حسرت بھری نگاہوں سے

دیکھ سکتے ہو

ریستوران کے سامنے سے گزرتے ہوئے

رنگا رنگ پکوانوں کی خوشبو سونگھ سکتے ہو

تم کسی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں نہیں بیٹھ سکتے

مگر تم ایئر کنڈیشنر سے باہر آتی

جھلسا دینے والی گرم ہوا سے

لطف اندوز ہو سکتے ہو

کارخانے کے مالک، سردار اور وڈیرے

علاقے کے تھانیدار کی جوتیوں میں بیٹھ سکتے ہو

تم چاہو تو بھوکے رہ سکتے ہو

پیاس کی شدت سے،

بیماری کے عالم میں دوا کے بغیر،

لُو یا سردی کے ہاتھوں

اور چاہو تو کسی نئی نویلی

للکارے مارتی کار کے نیچے آ کر

مر سکتے ہو

اتنے بہت سے کام کرنا تمھارے لیے ممکن ہے

پھر بھی تم اُس رحمٰن اور رحیم کا

شکر ادا نہیں کرتے!

☆☆☆☆☆

ازھر منیر

نئے سال کے نام

پھر طلوعِ سالِ نو ہے
پھر وہی ڈھلتا سفر ہے
دور تک یادوں کی دھندلی رہ گزر ہے
دھند میں چھپتا ہوا
اک پیڑ ہے، اک نام ہے، اک پھول ہے
یا برف کے دھبوں سے چپکی
غم زدہ کچھ دھول ہے
اک چشمِ وارفتہ کے پہلو میں
بجھے دل سے پرے خواب شکستہ
اک شبِ رفتہ
ہے شاید غمِ رفتہ
رنجِ آئندہ کا سرمایہ
اثاثۂ مہلتِ غم کا
ذرا کم۔۔۔
اور کم ہونے لگا ہے
تذکرِ تعبیرِ الم ہونے لگا ہے
پھر وہی کچھ آشنا لمحوں کی بے حس
اجنبیت
قہقہوں ان
پھلجھڑی سے
آنسوؤں کی جھلملاہٹ
درد کی سنجیدگی سے
زخم کی روئیدگی تک
بار ہا بجتی ہوئی خوشبو کی آہٹ
سانس میں گھلنے لگی ہے
پھر مہکتے، نو شگفتہ سال کی کھڑکی
گزشتہ سال کے
خاموش، اجڑے لان میں
کھلنے لگی ہے
ریزہ ریزہ سا پہر ہے
پھر وہی ڈھلتا سفر ہے
کیا انوکھی دھن ہے جی میں
کیسی لے ہے! کیسی رو ہے۔۔۔!
پھر طلوعِ سالِ نو ہے

حامد یزدانی

محبت خواب بنتی ہے

اقبال سروبہ

محبت آنسوؤں کو
کرب کا جب لمس دیتی ہے
تو صحرا میں
ہزاروں پھول کھلتے ہیں
محبت نیند میں کھوئی ہوئی
آنکھوں میں آ کر ڈوب جائے تو
سہانے خواب اگتے ہیں
محبت اس سے چشمِ فلک پر
خوبرو مہتاب بنتی ہے
فلک کے ریشمی آنچل
سے تارے توڑ لاتی ہے
محبت لفظ کے گہرے سمندر میں اترتی ہے
خیال و وصل کے موتی کنارے چوم لیتے ہیں
کتابِ عشق پر
تازہ غزل کا باب بنتی ہے
محبت خواب بنتی ہے

آج

دن کہ رقصاں ہے
اپنی وحشت میں
آج پھر مست ملے نہ ہو پائی
تیر چل جائے جیسے عجلت میں
روز کی طرح پھر سے دن آیا
آج پھر کام ہو نہیں پایا

کام دل کے کہے پہ ہوتا ہے
روز سورج کے چڑھتے ہی سوچا
آج گھڑیال کی منادی پر اپنی مرضی سے جاگنا ہوگا
آج اس شب کا سرو قامت جن
نیند کے مخملی سرہانے پر
خواب سے یدھ کر نہ پائے گا
آج پھر دن کے خالی ڈبے میں
ایک چٹکی پڑی ہے مٹی کی
مانگ لمحوں کی کیسے بھر پائے
دن کے چھینٹے لبوں پہ گرتے ہیں

آج کھولا ہے پھر رجسٹر کو
درج رکھا ہے کر کے صفحے پر
ایک وعدہ جو روز ہوتا ہے
آج کچھ روزگار سے ہٹ کر
آج کچھ انتظار سے ہٹ کر
ہٹ کے کچھ دور یاد یاراں تلے
غسل ہو آج ابر و باراں تلے

رخشندہ نوید

نئے زمانوں کا تعاقب

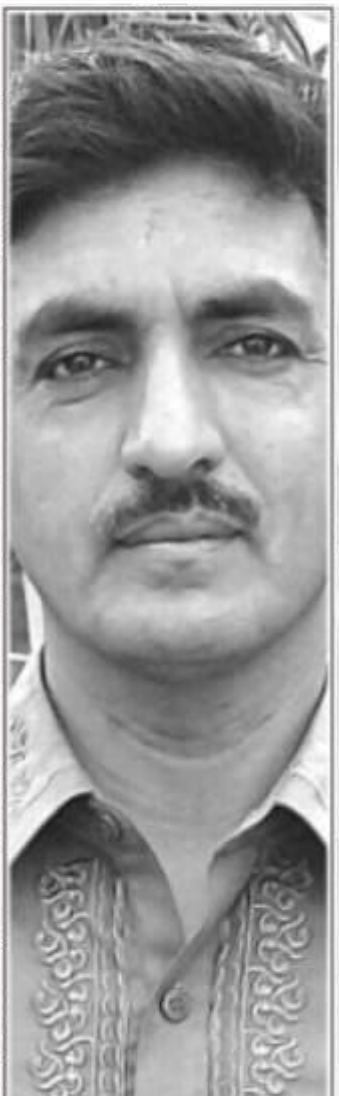

امجد بابر

[نثری نظم]

تبدیل کر دیا گیا ہے
نقشہ
محل وقوع
اخلاقیات
بدل چکے سبھی آداب زندگی

ہم ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں
خوف اور بھوک سے
کوئی کتنے عرصے تک بچے گا
شاید لمحوں کی سرگزشت ہے
یہ کہانی بھی لپیٹ دی جائے گی

بے چینی کا دھواں
جنگل کے باریش درختوں کو گھور رہا ہے
پرندوں اور پھولوں کو
روشن دنوں اور سیاہ شبوں کی تلاش ہے

ہم مستقبل کے نوزائیدہ بچوں میں
پاس ورڈز کی دنیا
پیچیدہ زندگی کی کلر سکیم
خود ساختہ تصورات کی آموزش ہی بانٹیں گے
بدل چکے ہیں
جھوٹ اور سچ کے پیمانے
البتہ
مکر اور طاقت کی گرفت مضبوط ہے

سالِ نو مبارک

نہیں ہے وقت سا کوئی کہیں ستم ایجاد
قدم قدم پہ جفائیں، روش روش بے داد

بچھڑ رہے ہوں جہاں ہم جلیس و ہم مشرب
وہاں نشاط کی ہوں خاک محفلیں آباد

جہان میرا، جہاں زلزلوں کی زد میں ہو
وہاں میں کیوں نہ رہوں محوِ نالہ و فریاد

کہاں وہ فصلِ بہاراں، وہ خوب رو چہرے
کہاں یہ اجڑے گلستاں یہ قاتل و صیاد

نہ رسم و راہ محبت نہ پاسِ مہر و وفا
فضا ہوئی ہے مکدّر بہ فیضِ زہرِ عناد

سکونِ روح کا باعث تھے حرزِ جاں تھے جو لوگ
انھیں گنوا کے تُو زندہ ہے دل، تو زندہ باد

غمِ جہاں سے فراغت نصیب ہو کیوں کر
ہر ایک صبح قیامت، ہر ایک شب افتاد

خیالِ امن عبث ہے، اماں کی بات فضول
کہ جل رہے ہیں ہزاروں بخارا و بغداد

کٹے تو کیسے کٹے کوہِ بے ستونِ الم
نہ میرے ہاتھ میں تیشہ نہ میں کوئی فرہاد

بکھر رہا ہے بتدریج کاروانِ حیات
میں اس خیال سے مغموم و بسمل و ناشاد

مگر ہیں اہلِ جہاں شاد اس قدر شوکتؔ
کہ دے رہے ہیں نئے سال کی مبارک باد

شوکت محمود شوکت

اُلجھن

اُلجھی گئی ہوں
نیا سال ہے تو
پرانے کا کیا ہو!!!!
مرے پاس ایسے، بہت سال ہیں
کہاں پر سجاؤں؟

کسی شیلف پہ یہ سماتے نہیں، نہ ہی یہ ٹوٹتے ہیں
یہ گٹھڑی میں بھی باندھے جاتے نہیں،
یہ ملبوس ہیں کیا؟ کہ دے دوں کسی کو
جو مجھ پہ ہے گزرا، وہ میرا رہے گا
سمجھ سے ہے باہر
یہ کیا ماجرا ہے؟

کہاں رکھ کے آؤں؟

جہاں پر گذشتہ کئی سال رکھے ہیں میں نے

وہ بجھنے لگے ہیں
انھیں سانس لینے کی حاجت نہیں کیا؟
کہ زندہ ہیں گر تو کبھی ملنے آئیں

اگر مر چکے ہیں تو مدفن دکھائیں

مری کچھ دعائیں،
ابھی ان کی تھیں

ردائیں بھی خواہش کی کھولی نہیں تھیں

جو گزری ہے اس کے کئی پل تو میں نے چھوئے
بھی نہیں تھے

لکیریں مٹیں جو پڑھی بھی نہیں تھیں
بہت دن تھے جن کی تہیں کھولنا تھیں،
لپیٹے گئے وہ

یہ ظالم سفر ہے

وہ سب کچھ جو ہاتھوں سے کھونا تھا مشکل

گئے سال کیا کچھ نہیں لے گئے
جہاں پر گئے، سب وہیں لے گئے
اگر ملنا چاہوں تو حد نظر تک
دکھائی نہ دیں گے

کبھی چھونا چاہوں تو پھر بھی یہ خود تک
رسائی نہ دیں گے

تو پھر کیا کروں میں؟
جو میرے تھے اب وہ بھی میرے نہیں کیوں؟
اُلجھی گئی ہوں

سعدیہ بشیر

سالِ نو مبارک (موازنۂ زندگی)

میں دے رہا تھا نئے سال کی مبارکباد
کہ میرے دل میں در آئی کوئی لطیف سی یاد
نگاہِ حال سے ماضی کے کچھ اشارے ہوئے
کھڑے ہی رہ گئے یادوں کو ہم پیارے ہوئے
وہ یاد جس نے کہ احساس کو جھنجھوڑ دیا
وہ یاد جس نے کہ حالات کو ہی موڑ دیا
جو یاد آئی مجھے وہ تھی ان دنوں کی یاد
ہر ایک دل میں تھا جب پیار کا جہاں آباد
وہ یاد جب مجھے ادراک کا ہوا عرفاں
وہ یاد جس نے کیا دردِ ذات کا درماں
وہ یاد جس نے مجھے رمزِ جہل و علم دیے
وہ یاد جینے کے گر جس نے دستیاب کیے
وہ یاد جس میں بسی تھی محبتوں کی مہک
وہ یاد جس کے دریچوں میں تھی وفا کی دھنک
وہ یاد جس کا تھا پل پل نشاط کا موسم
تھا جس کی گود میں ہر انبساط کا موسم
وہ یاد جس کے جلو میں تھی امن و یکجہتی
وہ یاد جس نے دیا ہم کو عہدِ خوش بختی
وہ عہد سونے کی چڑیا تھا جب ہمارا وطن
وہ عہد کانٹوں سے جب پاک تھا یہ اپنا چمن
وہ عہد پیکرِ انسانیت تھا جب انساں
وہ عہد جب تھی ہر اک دل میں دولتِ ایماں
وہ عہد جس میں محبت جوان ہوتی تھی
وہ عہد جس میں بصارت جوان ہوتی تھی
وہ عہد خونِ رگِ جاں کو جس نے گرمایا
وہ عہد خاص اخوت تھی جس کا سرمایہ
وہ عہد جس میں اشارے کلام کرتے تھے
حجاب و شرم و حیا کے چراغ جلتے تھے
وہ عہد جس کی ہر اک رت تھی گویا پیار کی رت
وہ عہد جس کی تھی آغوش میں بہار کی رت
وہ عہد جس کی تھی غم وا از ہر قرار کی رت
وہ عہد جس میں تھی ناپید انتظار کی رت
وہ عہد جس نے عطا کی وصالِ یار کی رت
وہ عہد جس نے دی پھولوں کو انتبار کی رت
یہی تمنا ہے وہ عہد پھر سے آ جائے
ہر اک عمل پہ ہمارے خلوص چھا جائے
مگر وہ عہدِ گزشتہ تو صرف خواب ہی ہے
بجز یہ خواب حقیقت فقط سراب ہی ہے

یہ عہد جس کی ہر اک رت ہے انتشار کی رت
نہ ہو گا پیار کا شاید یہاں گزارہ اب

یہ عہد جس نے کہ بخشی فراق یار کی رت
الٰہی خیر ہوئی برف بھی شرارہ اب

یہ عہد جس نے نوازی ہے اضطرار کی رت
کہ آگ آگ ہے کشمیر کا نظارہ اب

یہ عہد جس کی علامت صلیب و دار کی رت
کہ اب تو پھول سے لہجے بھی زہر اگلتے ہیں

یہ عہد چھین لی جس نے مرے وقار کی رت
یہاں چراغوں کے بدلے مکان جلتے ہیں

پھر اس نے بخش دی آنکھوں کو آبشار کی رت
تعصبات کی ہر شہر میں گڑی ہیں صلیب

یہ عہدِ موت جہاں زندگی سے سستی ہے
یہ عہدِ رفتہ ہے دراصل نفرتوں کا نقیب

ہر ایک ذہن میں سازش یہاں پہ پلتی ہے
اندھیرے امن کا سورج نگل رہے ہیں آج

ہمارے عہد میں انصاف اک کہانی ہے
الاؤ ظلمتِ باطل کے جل رہے ہیں آج

یہاں پہ ظلم و تشدد کی حکمرانی ہے
ہیں آنکھیں اشکوں سے بھیگی تو چہرہ چہرہ اداس

یہ عہد جس میں لہو آب کی علامت ہے
شکستہ پا ہوئی جاتی ہے زندگی کی اساس

یہ عہد جس کو روایات سے بغاوت ہے
سکوت ، تیرہ شبی ، بیبسی و مجبوری

یہ کیا کہ کلیوں میں دوشیزگی نہیں ملتی
کراہیں، چیخیں، تڑپ، درد اور لاچاری

یہ کیا کہ پھولوں میں پاکیزگی نہیں ملتی
ہمارے عہد کی یہ سب علامتیں ہیں ذکیؔ

میسر آج کسی کو نہیں حقیقی خوشی
جو نسلیں آئیں گی ان کی امانتیں ہیں ذکیؔ

کہ خشک ہونٹوں پہ رقصاں ہے زخمی زخمی ہنسی
تمہارے دل میں جو امن و اماں کی خواہش ہے

"یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر"
مسرتوں کے گلِ جاوداں کی خواہش ہے

یہ خوف کھائے ہوئے پل یہ سہمی سہمی پہر
دعا کرو کہ گزشتہ بہار چھا جائے

یہاں پہ ہو گیا نایاب بھائی چارہ اب
دعا کرو کہ وہی عہد پھر پلٹ آئے

ذکی طارق

گزارش

مجھکو زبان دی ہے تیرا شکریہ مگر
اک اور چیز اس سے بڑی مہرباں بھی دے

میری زبان کوئی سمجھتا نہیں یہاں
پروردگار مجھکو مرا ہم زباں بھی دے

تخلیق جو کیا ہے یہ کردار بے بدل
بے مثل سی اب اسکو کوئی داستاں بھی دے

بھیجا نئی زمین پہ تیری خوشی سہی
اب ایسا کر کہ مجھ کو نیا آسماں بھی دے

پھولوں کا تتلیوں کا مفسر کیا اگر
اس خارزار زیست میں اک گلستاں بھی دے

نفرت کی دھوپ تیز ہے تیرے جہان میں
اپنی محبتوں کا مجھے سائباں بھی دے

کشتی بھی تو نے دی ہے اور کشتی کو ناخدا
اب تو ہوا چلا کے اسے بادباں بھی دے

سچ بولنے کا تو نے دیا حوصلہ مجھے
اب صادقوں کا ایک مجھے کارواں بھی دے

وہ جس پہ ناز کرتا رہا ہے ازل سے تو
سارا نہیں تو تھوڑا سا ایسا جہاں بھی دے

دکھ وہ کہ میرا بولنا ممکن نہیں رہا
میری اذیتوں کا مجھے ترجماں بھی دے

عطاالعزیز

نثری نظم

مجھے اب چیزیں پہلے سے زیادہ شفاف دکھنے
لگی ہیں
دل کے بھیتر لکھی تحریر چہرے پہ لکھی صاف
پڑھی جاتی ہے
پھول لہجوں کی کڑواہٹ اب من کو
زہر آلود کرنے لگی ہے
سو میں اب اکثر خامشی اوڑھے رکھتی ہوں
بناوٹ اور تصنع کے غازے میں لپٹے محبت
بھرے جملے سماعتوں کو چبھنے لگے ہیں
مری اس خامشی کو تم اب
ماحول سے بغاوت سمجھو
یا پھر بھرم کھو دینے کا ڈر
آئسولیشن جذبوں کو پل بھر میں مسمار کر دینے والے
وائرس سے بچنے کا آخری علاج ہے
کہ میں نے تمہاری آنکھوں میں
تمہارے دل کی تحریر پڑھ لی تھی
اور لہجے کی بناوٹ سے روح اب تک گھائل ہے

نائلہ راٹھور

دسمبر اور جنوری کے درمیان

دسمبر کی اکتیس ہے
میں پوروں پر اکتیس گن نہیں پاتا
یہاں پر تیس تک ہی ساری گنتی ہے
یہی اک دن جو بچتا ہے
مجھے حیران رکھتا ہے
کہو، کیسے لکھوں میں تین سو پینسٹھ دنوں کی اُس اداسی کو
جو مجھ میں بین کرتی ہے
بہت سے تین سو پینسٹھ میرے کاسے میں رکھے ہیں
دسمبر کی اکتیس ہے گھڑی کی سوئیاں بارہ پہ آئیں گی
زمیں سے شور اُٹھے گا
فلک پر جگمگاہٹ کا سمندر موج زن ہوگا
سڑک پر من چلوں کی ٹولیاں ہارن بجائیں گی
گھڑی کی سوئی بارہ سے کھسک کر ایک پر ___ پھر دو پہ آئے گی
یہ شور و غل گھڑی کی سوئی سے اُٹکا گرے گا تیس پر جا کر
زمیں کا شور خاموشی میں بدلے گا
فلک کی جگمگاہٹ پر اندھیرا مسکرائے گا
صدا اُٹھے گی اکیس آ گیا۔ لو جان چھوٹی بیس سے اپنی ___ مبارک ہو
مگر پہلے ہی دن سے پھر وہی چکر چلے گا یوں کہ ہم مجبور و بے بس
تین سو پینسٹھ دنوں کے بھاری پہیے سے مسلسل روندے جائیں گے
صدا آئے گی بولو مت،
ذرا سا صبر کر لو
سال جانے میں فقط کچھ روز باقی ہیں

دسمبر کی اکتیس دھیرے دھیرے ڈوب جائے گی
حریرو پرنیا پہنے نئے دن مسکرائیں گے
میرا کاسہ پرانے تین سو پینسٹھ دنوں کو دفن کر دیگا

میں پھر سے تین سو پینسٹھ دنوں کے بھاری پہیے سے لٹکتا
آہیں بھرتا آنے والی جنوری سے ہاتھ ٹکراتا
بہت خوش ہوں کہ پچھلے تین سو پینسٹھ سے میری جان تو چھوٹی
مگر یہ جان کب چھوٹی،
کہ پہیہ چل رہا ہے اور میں پہیے سے لٹکا،
ہر نئے دن سے یہ کہتا ہوں
مبارک ہو
پرانے تین سو پینسٹھ دنوں سے جان تو چھوٹی
مگر یہ جان کب چھوٹی؟

اعجاز رضوی

خطوط

آصف ثاقب

"بیاض محترم" عزیز عمران منظور صاحب
السلام علیکم!
دسمبر کا یادرفتی "بیاض" دل کی مرادیں پوری کرتے آ گیا۔ یہ آئے تو اس سے جو جی میں چمک دمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ماشاء اللہ ایک سے ایک اچھا لکھنے والا موجود ہے۔ ایک محترم صاحب علم و ادب اس کی شان 'بیاض' کی تحریروں کی ترتیب میں ایک مستحسن ضابطہ ہے۔ عقیدت کا حصہ دل افروز ہے اور غزل و شعر کا حسن موہ لینے والا۔ 'بیاض' کی خاص بات ہے کہ اس کا دھیان کبھی کبھی کلاسیکل ادب کی طرف بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح مطالعے میں لطافت کا رنگ در آتا ہے۔ اس باب میں تنقیدی طرز و سازی کی نُچی بھی ہو جاتی ہے۔ مدح سے متعلق فقرہ ہے کہ وہ مخصوص بہتان کا نمائندہ ہے شگفتہ شعر کہتا ہے۔ غریب الفاظ استعمال میں لاتا ہے جب مدح کے یہ شعر دل کو لگتے ہیں اور غزل کو معراج تک پہنچاتے ہیں:

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں	ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

اس کی جوش نے بھی تعریف کی ہے۔

آتی جاتی ہے جا بجا بدلی	ساقیا جلد آ ہوا بدلی
تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت	ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں

کلاسیکل ادب گر 'بیاض' میں کبھی کبھی مذکور ہو تو جتنے بہت سوں کا بھلا ہو، یوں تو اس کے اثرات "بھیس" بدل کر جدید بیان و کلام میں بھی اظہار پاتے ہیں۔ غالب کا یہ ساختگی شعر اپنے انداز تخاطب کے اعتبار سے ہمہ گیر ہے۔

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا	باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

اس شعری میں میری کی "ترقی پذیری" کسی نہ کسی روپ میں دیکھی جا سکتی ہے۔
'بیاض' میں خطوط کا حصہ مجھے بہت پسند ہے۔ (دیگر احباب کی طرح) مشاہیر کے خطوط پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ خیر اندیش

جمیل یوسف

برادر عزیز جناب عمران منظور صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ
دسمبر 20 کا بیاض میرے سامنے ہے اور جناب اعجاز کنور راجہ کی غزل پر سر دھن رہا ہوں۔ سر دھننے پر عدم کا شعر یاد آ گیا ہے۔

جو شعر ہمارے سنتے ہیں مستی سے عدم سر دھنتے ہیں
ہم اہل طریقت کی باتیں، الہام کی باتیں ہوتی ہیں

جناب اعجاز کنور راجہ کی شاعری کا نقش پہلے بھی میرے دل پر ثبت ہے۔ راتوں کی تنہائیوں میں ان کا یہ شعر میں کئی دفعہ اپنی محبوبہ کو بھیج چکا ہوں۔

میں اکیلا تو نہیں ہوں شب تنہائی میں	تو بھی اس بزم میں شامل ہے، تجھے کیا معلوم

میں اس بات کو بڑی اہمیت دیتا ہوں کہ کسی شاعر کا کوئی شعر میرے ذہن نشین ہو جائے اور میں اسے دہرا دہرا کر دل اور لطف اندوز ہوتا رہوں۔ شاعر دراصل وہی ہے جس کا شعر قاری یا سامع کو یاد ہو جائے۔

اعجاز کنور راجہ صاحب کی غزل پر میں سر دُھن رہا ہوں آپ بھی اس کے خوبصورت اور دل آویز اشعار ملاحظہ کریں اور خوش وقت ہوں:

کیا کر دیا ہے ذات کے ادراک نے مجھے — گھیرا ہوا ہے وسعتِ افلاک نے مجھے
نازاں تھا برگِ خشک کی صورت وجود پر — شعلہ دکھا دیا دلِ سفاک نے مجھے
راس آ گیا ہے اپنی فقیری کا بانکپن — سب کچھ دیا ہے دامنِ صد چاک نے مجھے
میں نے تو اشک دامنِ دل میں گرائے تھے — رسوا کیا ہے دیدۂ نمناک نے مجھے
کن بستیوں میں گھل کے اداس ہو رہا ہوں میں — دہلا دیا ہے جرأتِ بے باک نے مجھے
اے آسماں! تیری عطا ہے مری زمیں — کیا کچھ نہیں دیا ہے مری خاک نے مجھے
ان لڑکھڑاہٹوں میں قدم ڈولتے نہیں — تھاما ہوا ہے کس کی کنور تاک نے مجھے

نسیم سحر

برادرم عمران منظور - سلام مسنون۔ دسمبر کا شمارہ سرورق کی دیدہ زیبی کے ساتھ نظر نواز ہوا۔

جناب آصف ثاقب کے خط میں محترم پروفیسر محمد ارشاد صاحب کے بارے میں پڑھ کر اس کثیر الجہات شخصیت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا، یہ بھی کہ ان کا پورا نام محمد ارشاد اعوان ہے۔ ابھی دونوں "فنون" کے تازہ شمارے میں بھی ان کی تحاریر نظر سے گزریں اور یوں ان کے بارے میں مزید آگاہی ہوئی۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے ان کا ایڈریس مل جائے تو میں انہیں اپنی کتب بھی ارسال کروں۔ اب کتب کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو تمام قلمکاروں اور قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا حمد و نعت کا تیسرا مجموعہ "محمود دو جہاں" حال ہی میں شائع ہو گیا ہے اور جو کوئی بھی یہ کتاب حاصل کرنا چاہے اسے میں یہ کتاب بلا قیمت ہدیۃً پیش کر دوں گا، لیکن چونکہ ڈاک خرچ بھی برداشت کرنا میری استطاعت سے باہر ہے اس لیے اگر وہ میرے ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر **03415166465**5 میں رجسٹری ڈاک کا خرچ مبلغ اسی روپے بھیج دیں گے تو ان شاء اللہ انہیں کتاب بھیج دوں گا۔ (کچھ استثنائی صورتوں میں یہ ڈاک خرچ بھی میں ہی برداشت کروں گا!)

حسبِ معمول اس شمارے کی شاعری میں سے پسندیدہ اشعار حمد، نعت اور غزلوں کے لکھ رہا ہوں۔

یہ ایک حرفِ دعا آ گیا زباں پہ مری
ہو جس میں تیری عبادت، وہ گھر رہے روشن
(حسن عسکری کاظمی)

وہ ہے خیر البشر، نور الہدیٰ، بدرالدجیٰ سب کا
کبھی پڑھتا، کبھی لکھتا رہا ہوں میں محمدؐ کا
(سید مقبول حسین)

کوئی لغزش، کوئی لرزش نہیں ہے اپنے ایماں میں
ہمارے دل کو حاصل استقامت ہے محمدؐ کی
(آصف ثاقب)

نعت گو کو وہ سنا دیتے ہیں جنت کی نوید
ایک مصرع بھی اگر نعت کے معیار کا ہو
(عقیل روحانی)

آپؐ کی توصیف کا دورانیہ ہے بیکراں
لمحۂ موجود - ماضی - ساعتِ آئندہ ہے
(سید ریاض حسین زیدی)

اس باب میں تاریخِ دو عالم بھی ہے حیراں
کب ہوتا ہے آغاز **وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ**
(سید حامد یزدانی)

آؤ • سیرت کتاب پڑھتے ہیں
آؤ • حل اپنی مشکلات کریں
(محمد حسین قمر)

شاہ کو یاں سے ٹھنڈی ہوا آئی تھی
اس لیے ہے دھنک جا بجا نعت کی
(سرور حسین نقشبندی)

احتساب احتساب کی رٹ پہ
سب کا ہو احتساب ، ممکن ہے
(روبی کنجاہی)

سوئے خواب جگا دیتی ہے مٹی کی خوشبو
سب کچھ تازہ ہو جاتا ہے پہلی بارش میں
(امجد اسلام امجد)

کہاں کچھ کسی نے نیا ڈھب اُسارا
وہی ایک نقشہ وہی اینٹ گارا
(تجمل عالی)

میں ایک مشت خاک تھا ، پتھر بنا دیا
پیہم گھما گھما کے مرے چاک نے مجھے
(اعجاز کنور راجہ)

عشاق کے دلوں میں کہاں پھانس یا چبھن
کانٹوں سے پاک صاف یہ گلدان رہتے ہیں
(انور شعور)

میکدہ پھر سے ہو گیا آباد
آ گئے اٹھ کے خانقاہ سے لوگ
(شاہد اعجاز)

کبھی بھول کر سرِ انجمن مرا ذکر بھی ہو تو دیکھنا
کہ چھلک پڑے نہ یہ چشم تر، مجھے بھول جا مجھے بھول جا
(راحت سرحدی)

بالآخر پا ہی لیتے ہیں یہ منزل
کہ دیوانوں میں دانائی بہت ہے
(کرامت بخاری)

ہم کو پاؤں بنانا آتے ہیں
تم کیے جاؤ بیڑیاں تخلیق
(منظور ثاقب)

مجھ سے آغاز ہو گیا میرا
میں جہاں میں عجب تمام ہوا
(ممتاز راشد لاہوری)

اسی لیے تو مجھے دیکھ کر گھٹکتے ہیں
کبوتروں کو بھی عادت دعا سلام کی ہے
(کبیر اطہر)

جنوں وقت کو شاید خبر نہ تھی اس کی
کہ مطمئن تھے بہت ، فرات سے دور
(شوکت محمود شوکت)

بڑے خیال سے مجھ کو کہیں بنایا گیا
پھر اہتمام سے مجھ کو زمیں پہ لایا گیا
(شبہ طراز)

اسی باعث میں شاید جی رہی ہوں
کہ میرے ساتھ سب کچھ مر رہا تھا
(درخشندہ نوید)

مار دیتے ہو تم روٹھوں سے
نام دیتے ہو خودکشی اس کو
(ارشد محمود ارشد)

پیدل کسی سڑک پہ بہت دور تک چلیں
ہاتھوں میں دے دو ہاتھ ، دسمبر کی شام ہے
(آفتاب خان)

اپنی دنیا تو پاس رکھ اپنے
میں بنا لوں گا کائنات اپنی
(سحر تاب رومانی)

روک لیتی ہے طلسمات کی جادو نگری
کب کوئی شہر حجابات سے آگے نکلے
(شاذیہ اکبر)

گیا برس بھی کچھ کم نہ تھے دسمبر کے
اکیلا سب کے برابر دسمبر آیا ہے
(اکرم جاذب)

میں وہی تمہارا صغیر ہوں جو صغیر تھا
مری وہ مدت کی ہی کال سن ، مرا حال سن
(صغیر احمد صغیر)

شہر ہے محبت کا اور مجھ کو حیرت ہے
ہر مکین شیشے کا ، ہر مکان شیشے کا
(خالق آرزو)

سب مسافر یہ سمجھتے ہیں مگر سچ یہ ہے
چاند چلتا تو نہیں ہے کبھی دلگیر کے ساتھ
(اسحاق وردگ)

صادق بھی اور امین بھی وہ شخص ہے وسیم
میری امانتوں میں خیانت کے باوجود
(وسیم عباس)

تمہارا ہجر مری روح چیخ بھرتی ہے
جسے میں دیکھنے بھاگا ، دکان تک نہ گیا
(اعجاز رضوی)

خاور اعجاز نے انگریزی سے جاپانی ہائیکوز کا ترجمہ خوب عمدہ کیا ہے۔ ایک ہائیکو میں Great Stream کا اردو ترجمہ ''ندی کنارے'' کر کے انہوں نے ندی کو بھی عظیم قرار دے دیا ہے۔ جس پر خوب ہنسی آئی۔

محترمہ نیلم احمد بشیر کا افسانہ ''اللہ کی مخلوق'' پڑھ کر مجھے بے اختیار بیاض ہی میں کچھ عرصہ قبل شائع ہونے والا اپنا ایک افسانہ یاد آ گیا جس میں ایسا ہی ایک سفاک دہشت گرد انسانی کھوپڑیوں سے کھیلنے کے بعد گھر جاتا ہے تو اس کی بیوی اسے مرغی ذبح کرنے کے لیے کہتی ہے جس پر وہ سخت برہم ہو جاتا ہے۔ خدانخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ نیلم احمد بشیر کا یہ افسانہ اس افسانے سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے کیونکہ یہ موضوع کسی کے ذہن میں بھی آ سکتا ہے۔ اور یہاں یہ اعتراف کرتا چلوں کہ انہوں نے جس سلجھے ہوئے انداز میں یہ افسانہ لکھا ہے میرے افسانے سے کہیں عمدہ اور اثر انگیز ہے۔ سعدیہ بشیر نے اپنے افسانے سیاست گری میں واقعی سیاسی موضوع پر خوب لکھا ہے اور علامتی انداز میں شیر کی سرداری، بندری تو بھیڑیے کی خونخواری بھی بندر ہے گی کہہ کر ہمارے سابقہ اور موجودہ سیاسی کرداروں کا خوب ذکر کیا ہے۔

نظموں اور بہت سے افسانوں اور مضامین کا ذکر رہ گیا ہے مگر ہر مرتبہ خط کچھ طویل ہو جاتا ہے اس لیے ان کا ذکر کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ تاہم جناب واجد امیر کا نصرت فتح علی خان جیسی عظیم شخصیت پر مضمون بے حد عمدہ انداز میں اس شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ کچھ مضامین البتہ اتنے مختصر لگے کہ موضوع یا صاحب موضوع سے مکمل انصاف نہ ہو سکا۔

آفتاب احمد ملک

برادر محترم جناب عمران منظور صاحب!

سلام نیاز مندانہ!!

''بیاض'' دسمبر کی بخ بستہ خشک ہواؤں میں آڑتا پھرتا رنگوں سے مزین خوبصورت پروں کے لہلہاتے ٹائٹل کے ساتھ سوہدرہ ہوا کیم کو باضابطہ لائن میں کھڑا ہوتے پنشن بروقت وصول نہیں ہوتی جو فوجی ڈسپلن کی طرح بروقت 241 صفحات پر مشتمل جریدہ موصول ہو جاتا ہے۔ ممنون ہوں۔

راقم کے خط صفحہ نمبر 239 برگ سفر نہیں ''برگ سبز'' پڑھیے گا۔ نثری تحریروں کا پسندیدہ مرقع ''شاہ داستان'' شعری انشائی کا معیاری و معلوماتی سفرنامہ ہے ''ہوائی'' کے اس سفر میں شاہ صاحب قارئین بیاض کو بھی دوش ہوا پر سفر کے ہمرکاب رکھتے ہیں۔ نثری شاعری بھی خوب ہے۔ ''دوش ہوا'' کو معروف شاعر رشید قیصرانی نے اس طرح شعر میں کہا کہ:

وہ گزرے تھے میرے سامنے دوش ہوا پر
میں دور کہیں ریت کے ٹیلے پہ کھڑا تھا

''شاہ داستان'' کا برادرم اسلام عظمی نے ناقدانہ تجزیہ کیا ہے اور چکوال کے دیرینہ تین شعرا دوستوں کا تذکرہ بھی۔ قیوم طاہر راولپنڈی کی آزاد فضاؤں میں اردو کی خوبصورتی شاعری میں مستغرق ہیں۔ منور عزیز صاحب اپنی بیگم کے انتقال کے بعد بچوں کے ہاں واہ کینٹ ہجرت کر گئے ہیں۔ نور ملک چوا سیدن شاہ اس وقت شہر گلیاں کے بجائے شہر خموشاں کے مستقل مکین ہیں۔ محترمہ فوزیہ غزل کا معلوماتی ادبی مضمون مصطفےٰ زیدی۔ فن اور شخصیت بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ زیدی (مرحوم) کم عمر ڈپٹی کمشنر بیوروکریٹ تھے۔ 1959ء میں اپنی بیوی ''ویرا'' کے نام سے ایک شعر منسوب ہوا وہ ضرب المثل شعر میں مضمون میں درج ہے۔ جب زیدی صاحب 1961ء میں ڈی سی جہلم تھے۔ وادی خاؤس بکر کے ریسٹ ہاؤس جو اب اسے بی ہاؤس رہائش گاہ ہے مین گیٹ کی سنگ مرمر کی تختی پر مذکورہ بالا شعر کندہ ہے ___ دوسرا ضرب المثل شعر زندہ و تابندہ ہے ___ کہ:

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

شاعری کے صفحات میں 65 غزل گو شعرا اور حصہ نظم 21 نظم گو شعرا کے کلام میں نئے تخیلات اور تماثیل پڑھنے کو ملی ہیں۔

1942 کا مطبوعہ کلام احمد ندیم قاسمی تلاش کر کے شائع کرنے کا شکریہ گویا 78 سال قبل شاعری کا عکس 2020 میں بھی حساس قلوب کے لیے کشش کا باعث ہے۔

حمد، نعت، عقیدت میں دینی شاعری اور آیات قرآنی کے حوالہ جات شعراء کرام کی اعلیٰ تخلیقی توانائیوں کے عکاس ہیں۔ ہائیکو میں جدیدیت گویا موضوعات کو اس صنف کی مقبولیت نمایاں نظر آتی ہے۔ افسانے بھی خوب ہیں۔ انعام الحق جاوید طنز و مزاح کے بادشاہ ہیں۔ اور اقتدار ثانی بھی ظرافت کی دنیا کے متحرک مسافر۔ چند غزل گو شعراء کے پسندیدہ و معنی خیز اشعار دیکھیے جو دسمبر 2020 کے شمارے میں نظر آئے۔ ایک ایک شعر الگ کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔ مثلاً

ہم نے لکھی وہ شاعری، لہجہ ہے پُرسوز
جس کی سُرخی ہے متن ہے، خون بھری دوات
(آصف ثاقب)

سوئے خواب جگا دیتی ہے مٹی کی خوشبو
سب کچھ تازہ ہو جاتا ہے پہلی بارش میں
(امجد اسلام امجد)

سخن میں نکالی نئی راہ عالی
کہیں کب ابھرا کوئی رنگ اُدھارا
(جلیل عالی)

وہاں آگیا ہے اپنی فقیری کا بانکپن
سب کچھ دیا ہے دامنِ صد چاک نے مجھے
(اعجاز کنور راجہ)

کوئی کتاب، نہ دم ساز ہے کہاں جاؤں
اُجڑ گیا ہے مرا گوشۂ چمن کب سے
(حسن عسکری کاظمی)

ریاض دل ہے دولت کرب جاں کی
ہنر اشعار کا سستا نہیں ہے
(سید ریاض حسین زیدی)

عمر ساری حروف لکھتا رہا
لکھ کے لوحِ جہاں پہ چھوڑ آیا
(کرامت بخاری)

آفتاب خان کی ایک غزل دسمبر صفحہ نمبر 101 (6) اشعار اور صفحہ نمبر 108 پر اکرم جاذب کی غزل کے (9) اشعار میں کیا ترجمانی ہے ایک ایک شعر دسمبر کی نسبت سے کئی موضوعات سمیٹے ہوئے ہیں قلم کار بھائیوں کے سات خطوط گزشتہ شمارے پر ناقدانہ رائے، تجاویز و آراء شامل ہوتی ہیں چونکہ محدود صفحات میں مختصراً تاثراتی تحریر کیا جا سکتا ہے۔ احباب کے اعتراضات، حوالہ جات سے اصلاحی سطور، مختصر طویل خط نگاروں پر انحصار ہوتا ہے۔ اندرونی صفحے پر 6 نئی کتابوں کے فرنٹ ٹائٹل دیکھ کر بے پایاں علمی و ادبی طمانیت ہوئی۔ مہنگی کتب خریدنے سے قاصر ہے البتہ تبصرہ جات پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ 2020 بیت گیا یادیں اور باتیں ہمارا ادبی اور شعری دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ مستقبل کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

کیوں کر میں کروں وعدہ فردا پہ بھروسہ
کل تک تو خدا جانے مرے کون جیئے کون؟ اور
ہم غریبوں کی تربت پہ جلائے گا دیے کون؟

فرخندہ شمیم

جناب عمران منظور صاحب

بہت عرصہ بعد خطوط کے اس پر فکر حصے میں شرکت کر پا رہی ہوں۔۔۔۔۔ اللہ کریم اس حسین پرچے کے تیار کنندگان کو سلامت رکھے۔

دسمبر کے شمارے میں افسانوں کا گوشہ بطور خاص پڑھنے کا موقع ملا۔۔۔ محترمہ نیلم احمد بشیر کا افسانہ "اللہ کی مخلوق" اپنے موضوع کے اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔۔۔ مذہب کے نام پر انتہا پسندانہ دہشت گردی اور شدت پسندی کی اسلام فوبیا کے لیے مستقل راہ ہموار کر رہی ہے۔ مصنف نے دینی تربیت کے غیر دینی رویوں پر بھی ہے اور

واقعات کی حقیقی عکاسی کی ہے اور اس نظریاتی تضاد کو بھی باریکی سے پیش کیا ہے جسے نام نہاد اہل دین مذہب کی آڑ میں پروموٹ کر رہے ہیں---- تاہم افسانے کا اسلوب بہت حد تک روایتی نظر آتا ہے---- جو بیانیہ نہیں بلکہ ایک بھرپور تاثراتی انداز تحریر ہے، جس میں رواں کشمیری کا ساز اٹھتا ہے---- افسانے میں کچھ اشاراتی جملے ہونے چاہیے تھے تاکہ قاری اپنے ذوق، تجسس سے سمجھتا چلا جاتا۔

صبا ممتاز بانو کا افسانہ "تہی دامن" عورت کی نازک خیالی پر بنیاد کرتا افسانہ ہے---- کہانی کی مرکزی عورت حقیقت پسند، وجدان آمیز اور بچاؤ کی خواہش مند ہے لیکن اس کے محسوسات کوئی دھوکہ کھانے پر تیار نہیں ہیں---- افسانے کا موضوع عمدہ ہے لیکن اسے کفایت لفظی کے ساتھ بیان کرنے سے تاثر کو مزید تقویت مل سکتی تھی۔

افسانے عمروں کا پچھتاوا اور آخری فیصلے کے بعد حقیقت پر مبنی موضوعات لیے سلیس اسلوب کے حامل افسانے ہیں۔ افسانہ "آدمی" صرف اس لیے کچھ غیر حقیقی لگا کہ اس کے سارے کردار ایک ہی سر اوڑھنے میں مصروف نظر آتے ہیں---- واقعات کے بیانیے میں ترتیب کا سقم کھٹکتا ہے---- افسانے کا کلائمیکس آسان ہے، اس لیے آخری فقرہ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سعدیہ بشیر کا مائیکرو فکشن "سیاست گری" ایک چست اسلوب کی اٹھان لیے پیدا آیا---- سیاست کے اپنے جنگلی قوانین اور ضابطے ہیں جن سے انسانیت کو کم ہی فیض ملا ہے---- علامتی اسلوب اور کنایوں پر افسانہ نگار کی گرفت مضبوط ہے۔

رانا محمد شاہد

جناب عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

دسمبر کے بیاض کا سرورق انتہائی دیدہ زیب تھا۔ افسانوں میں تسنیم احمد بشیر کا "اللہ کی مخلوق" صبا ممتاز بانو کا "تہی دست" اور شاہد ریاض کا "پچھتاوا عمروں کا" پڑھے ہیں۔ تینوں اچھے لگے۔ سعدیہ بشیر کا مائیکرو فکشن "سیاست گری" کمال کا تھا۔ پروین عزیز قاسمی کی طنز و مزاح پر مبنی تحریر "تیجا جھری یار" دلچسپ رہی۔ محترم ندیم سید نے سچ لکھا کہ جواز جعفری کی شاعری دور حاضر کے دکھ اور خواب بیان کرتی نظر آتی ہے۔

نصرت فتح علی خان، مصطفیٰ زیدی، امرتا پریتم اور خالد احمد جیسی شخصیات پر خوبصورت تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ خاقان آرزو، اسلم کولسری، آفتاب خان، نجمہ منصور اور ریاض ندیم نیازی کی شاعری کو بھی بھرپور انداز میں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ نسیم سحر کی اس بات سے اتفاق ہے کہ خطوط میں شاعروں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کے اشعار کا ذکر کرنا جوابی تحسین کے لیے نہیں ہے۔ میں شاعری نہیں کرتا۔ مگر اچھی شاعری کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہے۔ جو غزلیں پڑھی ہیں ان میں سے کچھ اشعار اچھے لگے۔ ان کا ذکر یہاں کرتے ہیں:

میں ایک مشت خاک تھا، تجھ نے بنا دیا　　ہیم گھما گھما کے مرے چاک نے مجھے
اے آسماں! تیری عطا ہے مری زمیں　　کیا کچھ نہیں دیا ہے مری خاک نے مجھے

اعجاز کنور راجہ

اک شعر جو کسی کو سنایا نہیں گیا　　پلکوں تک آ گیا تھا، گرایا نہیں گیا
رکھنا تھا جس کو یاد اسی کو بھلا دیا　　اور جس کو بھولنا تھا، بھلایا نہیں گیا

اکرم ناصر

اکرم سحر فارانی کی غزل کے یہ اشعار حالات حاضرہ کی بھرپور عکاسی کر رہے تھے۔

مفلس کا سر قلم ہوا تو جوں نہیں رینگی کانوں پر　　دولت مند کو چوٹ لگی تو شور مچا ایوانوں میں
مدت سے زرداروں اور شریفوں میں یوں گھیرا ہوا　　جیسے ہو محکوم رعایا بکے ہوئے سلطانوں میں

دردانہ نوشین خان

عمران منظور صاحب
السلام علیکم!
میں وزٹ میں وطن عزیز سے غیر حاضر رہی۔ 10 دسمبر کو دبئی سے واپسی ہوئی تو تکتے والی میز ادبی رسائل سے مہک رہی تھی۔ ہر نیا رسالہ کھولتے ہوئے آج بھی سکول کے زمانے والی کتابوں کی خوشبو میری سانسوں کو مہکاتی ہے۔
'نیاافق' نومبر 'نیاافق' دسمبر 2020 دیکھ کر پتا چلا کہ سے ہٹ کے لڑکیاں لکھ رہی ہیں۔ کیا بچیاں بھی آغاز سفر تو ہے۔

'نیاافق' کے دونوں سرورق دل کو سکون بخشنے والے لطیف رنگوں میں تھے۔ نئی کتابیں بھی چھپ رہی ہیں ان کے رنگین اشتہار لگے رہتے ہیں۔ رسالے کے اندر احباب ایک دوسرے کی کتب اور شخصیتوں پر لکھ رہے ہیں۔ گلشن امید کھلا ہوا ہے۔
اعتزاز ندیم سید سجاد جعفری کی شاعری پر لکھتے ہیں تو اسلام عظمی "شاد و داستان" کے قیمتی فقروں کی طرف توجہ کروا رہے ہیں۔ واجد امیر حضرت فتح علی خاں کے زمانے پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ حضرت فتح علی خاں کا اصل نام پرویز تھا (کتنی کہتے تھے) انھوں نے قوال کا مرکز کے بجائے سائیڈ (کتی) پر بیٹھنا شروع کیا اور یہ دستور بن گیا۔
آفتاب خان کی شاعری پر مسعود تنہا نے تحریر کیا ان کے شعروں میں اکثر آفتاب مستقل ہوتا تھا جب سوشل پہ یا رسائل میں ان کو پڑھا مصطفیٰ زیدی پہ فوزیہ غزل اور محمد منصور پہ راشد محمود راشد کے قلم لفظوں کے پھول بکھیر رہے ہیں تو پرویز احمد چاند پوری ریاض ندیم نیازی کے نعتیہ مجموعے "فیض اولیاء" پر لکھ کر ثواب کما رہے ہیں۔
خالد احمد کا نام جگمگاتے ستاروں میں مہتاب جیسا ہے۔ محمد عارف نے ان کی شاعری پر تر دامنہ تحسین پیش کیا ہے۔ نظموں میں ایک طرف سینئر شعرا کا لب و لہجہ کلام ہے تو دوسری طرف جونیئر ز کا پختہ عزم کلام ہے۔
دسمبر 2020 کے 'نیاافق' کے افسانوں میں کلیم احمد بشیر کا افسانہ "اللہ کی مخلوق" دہشت گردوں کی تربیت اور ماحول کا منظر دکھاتا ہے۔ ایک زہر میں بجھا ہوا تیر ہے جو حساس دل کو فگار کرتا ہے۔ تربیت کار سفاکانہ انداز میں اسلام کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ انسان کا اصل سا لقین روپ ایسا ہی ہوتا ہے۔
قیصرہ آصف خان کا افسانہ "مجرم" "نصیحت کا پہلو رکھتا ہے۔
"تہی دست" میں صبا ممتاز بانو نے مرد کے دل و نظر میں محبوبہ اور بیوی کا فرق ظاہر کیا۔ محبوبہ مرد کے لیے "کم خرچ بالا نشین" مال ہے۔
نثار ریاض نے "کچھ تو وا عمروں کا" لکھا۔ یہ ڈائجسٹ اسلوب ہے اور اس کے مکالمے ڈائجسٹ رائٹرز کے ٹی وی ڈراموں سے مشابہ ہیں۔
انور کمال شاد کے افسانے "آخری فیصلے کے بعد" میں شرافت نامی مرد کی شرافت سے ایک عورت کو باعزت زندگی مل گئی۔
نومبر 2020 کے 'نیاافق' میں سلمٰی اعوان نے "محلے کے نام ہے یا ان بختوں کے لیے" مرحومین عصر اول کی نمائی کی مگر محمود عول نگار خواتین پر اظہار خیال کیا۔ عائشہ احمد جاوید نے موجودہ بدترین سانحہ کے پس منظر میں تاثرات لکھے۔ 'نیاافق' ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں فن کے طے شدہ فارمیٹ سے نکل کر بھی آزادی اظہار کے موقع دیے جاتے ہیں۔ ایسا ہی میرا ایک اظہار خیال آپ کے پاس منتظر اشاعت ہے۔
والسلام

ادبی مضامین
ساختہ
اسلام عظمی

آوٹ سائیڈر

صبیح رحمانی
کی
نعتیہ شاعری

غالب کے نقشِ قدم پر

باب العلم
GOVT. MIANNA COLLEGE

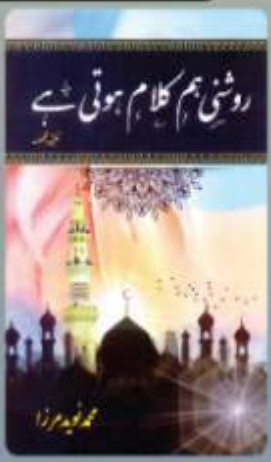
روشنی ہم کلام ہوتی ہے
محمد نوید مرزا

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888